ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و درد مند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبعِ بلند

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد ایک مشتِ خاکستر میں تھا

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

(اقبالؒ)

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

شوال ۱۴۲۵ھ
نومبر و دسمبر ۲۰۰۴ء

جلد نمبر ۳۰

شمارہ نمبر ۱۱-۱۲

مدیر مسؤل

ابوالمکارم ازہری فلاحی

معاون مدیر

انیس احمد فلاحی مدنی

☆ سالانہ زرتعاون: ۹۰ روپے
☆ خصوصی زرتعاون: ۲۰۰ روپے
☆ بیرون ملک: ۲۵ امریکی ڈالر

☆ طلبہ کے لئے: ۸۰ روپے
☆ اعزازی زرتعاون: ۱۰۰۰ روپے
☆ اس شمارہ کی قیمت: ۱۵ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ لہذا جلد از جلد سالانہ زرتعاون ارسال فرمائیں۔

❖❖ مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے ❖❖

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ مجلہ حیات نو، جامعۃ الفلاح
بلریاگنج، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۱۲۱
Phone: 05466-225115

نقوش حیات نو

☆ **اداریہ :**		
آہ! حکیم محمد ایوبؒ	ظفر عالم خاں نصیر پوری	۳
☆ **روشنی کا سفر :**		
ڈاکٹر ملیکا بیگوچ	محمد سوئیل فلاحی	۵
☆ **مقالات :**		
تاریخ رواۃ	ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب	۱۲
توریت میں بشارات محمد یہ ﷺ (۳)	ابوطوبی فلاحی	۱۷
جامعۃ الفلاح کا قیام	عبد الرحمن زریاب	۳۱
☆ **شعر و نغمہ :**		
نذرانۂ عقیدت	قمر رسول پوری	۴۶
☆ **تعارف کتب :**		
اسلامی مصادر کا تعارف فقہ مالکی کے اہم مصادر (۱۱)	ڈاکٹر عبد الوہاب ابراہیم ابوسلیمان	۴۷
☆ **مذاہب عالم :**		
توریت کا تعارف توریت اور قرآن مجید کے مشترک امور	انیس احمد مدنی	۵۱
☆ **بحث و نظر :**		
سماع حدیث اور اس کی روایت	ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب	۵۶
☆ **فقہ و فتاویٰ :**		
میت کی جانب سے قربانی کا حکم بھینس کی قربانی کا حکم قربانی کے جانوروں کی شرطیں ایام قربانی قصاب کو اجرت کے طور پر چمڑا دینے کا حکم	ابو ارقم فلاحی	۶۰
☆ **جامعہ کے لیل و نہار :**		
سال نو کا آغاز مہتمم تعلیم و تربیت کا افتتاحی خطاب جامعہ کے بعض قدیم اساتذہ کی سبکدوشی بین الاقوامی سیمینار	ادارہ	۶۳

اداریہ

آہ! حکیم محمد ایوبؒ

(ظفر عالم خاں نصیر پوری)

اس سال رمضان المبارک کی ۷ تاریخ بروز جمعہ حکیم محمد ایوب صاحب (بلریا گنج) اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)

ان کی شخصیت قرب و جوار میں اس قدر مقبول و محبوب تھی کہ جنازے میں سوگواروں اور ہمدردوں کی اتنی بڑی تعداد شریک ہوئی کہ جامعۃ الفلاح کے وسیع و عریض میدان نے اس سے قبل شاید ہی ایسا منظر دیکھا ہو۔ بہر کیف ایسی شخصیت جہاں کہیں ہوں اپنے روشن نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو پشتہا پشت تک آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں اور واقفات رفتہ کے چشم دید گواہ بن کر اس شخصیت کی عظمت اور قدر و منزلت کی قسمیں کھاتے رہتے ہیں۔ نیز ایسی شخصیات وہ ہوتی ہیں جو خود کسی عظیم تر شخصیت کے افکار و کردار سے تشویق پا کر کسی بڑے مقصد کے حصول کی جانب سرگرم عمل ہو جاتی ہیں اور اپنے اخلاص، جہد پیہم کی بدولت بہت سے ذہنوں کو گرویدہ اور دلوں کو ہمنوا بنا لیتی ہیں۔ اس طرح لوگ جڑتے جاتے ہیں اور کارواں ہوئے منزل رواں دواں ہو جاتا ہے۔ جامعۃ الفلاح کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ جہاں مولانا مودودیؒ کے مشن پہ لبیک کہنے کے لئے صدائے بلالی بلند کی گئی تھی اور وہ صدائے بلالی اصل میں صدائے ایوبی ہی تھی۔

اور یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس دیار کے افق پر نصف صدی قبل دو اہم چیزیں نمودار ہوئیں اور تقریباً ساتھ ساتھ عروج کی منازل طے کرتی رہیں۔ ایک طرف حکیم ایوب صاحب علم حکمت سے فراغت کے بعد قصبہ بلریا گنج میں تشریف لائے اور ہر طرف سے مایوس، لا علاج مریضوں کو بھی حیرت انگیز طور پر شفایاب کر کے فن طبابت کو ایک نئی جلا بخشی۔ ان کا طریقہ علاج اوروں سے مختلف اور منفرد تھا جسے ایوبی جڑی بوٹی کا نام دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسری جانب جامعۃ الفلاح تعلیم و تدریس کی شاہراہ پر انتہائی تابانی و شادمانی کے ساتھ گامزن رہا۔ مگر افسوس وہ دن بھی آیا جب فطری عارضوں نے دھیرے

دیر سے حکیم صاحب کی صحت کو رو بہ زوال کر دیا مگر پھر بھی ان کے حوصلے اور استقامت میں کمی نہیں آئی۔ آخر دم تک بستر پر لیٹے لیٹے مریضوں کو دیکھتے اور نسخہ جات تجویز کرتے رہے۔ یعنی آخر دم تک اپنے کو انسانی خدمات پر مامور رکھا۔ انھیں مخدوم بننے کے بجائے خادم بنے رہنا زیادہ مرغوب تھا۔ خوش اخلاقی، مہمان نوازی، حق گوئی و بے باکی ان کی شخصیت کے کچھ نمایاں عناصر تھے۔ فہم دین اور زہد و تقویٰ نے بھی ان کو زاہد خشک نہ ہونے دیا۔ ادبی ذوق، سیاسی شعور اور بذلہ سنجی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایک بار مسجد میں نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا ایک مسافر نمازی ہاتھ اٹھا کر زور زور سے دعا مانگ رہا ہے "یا علی مدد ہو! یا علی مدد ہو!" موصوف چپکے سے اس کے پاس گئے اور کان میں بڑے معصومانہ انداز سے کہا "آج کل اللہ میاں کی حالت کچھ پتلی ہو گئی ہے کیا؟"

ایک بار اپنے یار غار انتہائی معتمد رفیق کار منشی انور صاحب کے ساتھ کہیں سے گذر رہے تھے ایک شخص قیمتی شالیں فروخت کر رہا تھا۔ ایک شال کی قیمت دس ہزار روپے تک تھی۔ منشی انور صاحب دیکھنے لگے تو حکیم صاحب نے فرمایا: "چلئے منشی جی اگر اتنی رقم جیب میں ہوگی تو اس شال سے زیادہ گرم کرے گی۔"

ان کی سادہ مزاجی کا یہ حال تھا کہ اللہ نے انھیں پوری توفیق دی تھی۔ رزق حلال سے بھرپور نوازا تھا۔ اگر چاہتے تو سونے کی پیالی میں رس ملائی کھاتے مگر انھیں دیسی گڑ کا شربت ہی شربت اعظم لگتا۔

راقم السطور کے لئے ان کی شخصیت کا سب سے جاذب پہلو یہ تھا کہ موصوف نے تمام تر شہرت و ثروت کے باوجود ہمیشہ انکساری و خاک نشینی کو ہی افضل جانا۔ کبھی بھی اپنے کو رکن مجلس ملائکہ نہیں سمجھا۔ اور سماج کے مفلس و نادار لوگوں کی خاموش طریقوں سے خبر گیری و مدد کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سوگواروں میں غیر مسلموں (خاص طور سے پسماندہ طبقات) کی خاصی بڑی تعداد شامل رہی جن کے چہرے رنجیدہ اور آنکھیں اشکبار نظر آئیں۔

خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ حکیم صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

روشنی کا سفر

ڈاکٹر ملیکا بیگو وچ

Dr. Mellika Begovic

ترجمہ و تلخیص: محمد سہیل فلاحی
ایم۔اے۔انگلش

Dr. Mellika Salihabeg Bosnawi ڈاکٹر ملیکا صالحہ بیگ بوسنیاوی عرف ملیکا بیگو وچ نے کافی عرصے تک جہالت کی دنیا میں رہنے کے بعد آخر کار ہدایت کا وہ راستہ پا لیا جسے انھوں نے کافی مضبوطی سے اب پکڑ رکھا ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ گمراہی اور ارتیاب کے جہنم میں رہنے کے بعد نجات کا راستہ صرف یہی ہے۔

یہ ۱۹۷۶ء کا زمانہ تھا۔ ایک کیمونسٹ ظلمت جس نے ان کو فرانس میں تعلیم حاصل کرنے اور Phd. کی ڈگری حاصل کرنے میں مدد کی تھی، اعلان کیا کہ "ڈاکٹر ملیکا بیگو وچ نے اس کیمونزم کو ترک کر دیا ہے جس سے یہ کافی لمبے عرصے تک وابستہ رہی ہیں اور اپنے ماضی کے دوستوں کے ساتھ انھوں نے ایک نظریاتی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔"

پیش خدمت مضمون میں ڈاکٹر صاحبہ سے ایک تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جس میں انھوں نے اپنے دوران اسلام اور اس سے پہلے کے حالات کو اچھی طرح سے اجاگر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انھوں نے کس طرح سے ہدایت کا راستہ پایا۔

ڈاکٹر ملیکا بیگو وچ ایسے مغربی ماحول میں پروان چڑھیں جو بہت ہی پیچیدہ مغربی طرز زندگی کی نمائندگی کرتا ہے اور جسے کیمونسٹ حکومت نے عوام پر زبردستی لاگو کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ تمام لوگ جنھوں نے اس مخصوص طرز زندگی سے انکار کیا وہ اس سماج میں ایک قابل رحم زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے اور کیمونزم کا یہی جمہوری بحران اس کے سقوط کا سبب بنا۔ اس لئے کہ انسان سماج میں ایک دوسرے سے گفتگو کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔

۱۹۷۰ء کا سال تھا جو میری زندگی میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس سال پہلی دفعہ میں نے قرآن مجید کا انگریزی میں باقاعدہ ترجمہ پڑھا اور یہی میرے اسلام قبول کرنے، تمام جدید فلسفیانہ اور ارتقائی نظریات سے منہ موڑنے کا خاص سبب بنا۔ مجھے اچھی طرح سے احساس تھا کہ دنیا میں کوئی بھی ترقی پسند نظریہ ایسا نہیں ہے جو روحانیت یا روحانی سکون سے بڑھ کر کے ہو اور انسان کی خود اعتمادی سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی اور خوشی نہیں ہو سکتی۔ اسی سال میں نے لندن کا سفر کیا اور اسلامیات پر متعدد کتابیں خریدیں تا کہ اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کر سکوں۔

<u>سوال: وہ انقلاب جو آپ کی زندگی میں اسلام قبول کرنے کے بعد آیا، کیا اس نے دوسروں کو بھی متاثر کیا اور کیا جدید یوگوسلاوین نظریات اتنے زیادہ کمزور تھے کہ وہ دوسرے نظریات کے سامنے ہلکے پڑ گئے؟</u>

<u>جواب:</u> اس وقت میں یوگوسلاویہ میں ایک مصنف کی حیثیت سے کام کر رہی تھی اور اپنے سماج کے خاص خاص تہذیبی پہلوؤں پر میں بڑے اعتماد کے ساتھ لکھ رہی تھی۔ اس وقت میں زندگی کے متنازعہ مسائل کی تفصیلات جاننے کی بے حد شوقین تھی۔ میں نے سماجی مسائل کو تھوڑا مختلف انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا اور یہ چیز میرے معاشرے میں مذہب کے ٹھیکیداروں کو بڑی گراں گزری۔ مجھے حجاب پہنتے ہوئے ابھی صرف نو مہینے ہی ہوئے تھے کہ نوکری سے نکال دیا گیا اور میری کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ اور سات پولیس والے ایک دن آئے اور مجھ کو جیل میں قید کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا بارہ سال کا بچہ گھر پر تنہا رہ گیا۔ لگ بھگ ڈھائی سال میں نے جیل میں گذارے تھے اور اس دوران وہ مجھ کو مختلف جیلوں میں منتقل کرتے رہے اور طرح طرح کی اذیتیں اور ذہنی تکالیف دیتے رہے۔ اس دوران میرا ہتھیار صرف خدا کو برابر یاد رکھنا، دعا کرنا اور وہ بھوک ہڑتال تھی جس کے ذریعہ میں ان کے خلاف لڑتی رہی۔ میری بھوک ہڑتال کا سلسلہ تقریباً ۲۷ دنوں تک چلتا رہا اور میں بالکل مرنے کے قریب ہو گئی تھی۔

اس قید کے بعد پاسپورٹ کے حصول کے لئے مجھ کو ایک نئے تجربے سے گذرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یوگوسلاویہ میں کچھ مسلم ممالک کے دفاتر، بین الاقوامی میڈیا اور انسانی حقوق کی

تنظیموں کی جانب سے مجھ کو خاطر خواہ مدد ملی۔ ان لوگوں نے میرے حق میں آواز اٹھائی اور آخر کار حکومت کی جانب سے پاسپورٹ مجھ کو جاری کیا گیا۔ اور برطانیہ میں میں نے سیاسی پناہ حاصل کی۔ میں نے دوسرے بہت سے ممالک بشمول کناڈا اور مصر کا بھی اس دوران دورہ کیا۔ اس وقت دنیا میں میں غالباً پہلی مسلم خاتون تھی جس نے بوسنیائی عوام پر کمیونزم کے ظلم و تشدد کو لوگوں کے سامنے اجاگر کیا۔ جس طرح آج دنیا میں بہت سی عورتیں جدید فیشن کے لباس اور بناؤ سنگار کے سامان کے حصول کی خاطر دورے کرتی ہیں اسی طرح میں نے بہت سی بین الاقوامی لائبریریوں کا علم کے حصول کی خاطر دورہ کیا۔ اس دوران میں نے تقریباً چھ ممالک کے دورے کئے اور ایک ناول لکھا جس کا عنوان تھا ' Pure Souls on the Fierce agression against Palestine ' اس ناول کے مکمل ہونے میں تقریباً دو سال لگ گئے۔

<u>سوال: اس کے علاوہ آپ کتنی کتابیں اور ناول لکھیں؟</u>

<u>جواب:</u> میں نے تقریباً چودہ کتابیں لکھی ہیں جن میں کچھ فلسفیانہ موضوع کا احاطہ کرتی ہیں اور کچھ ناول ہیں اور کچھ تہذیبی و سیاسی مسائل سے متعلق ہیں۔ بحیثیت کیا فنسٹ میں نے کچھ کتابوں پر متعدد ایوارڈ بھی حاصل کئے جو بار بار شائع بھی ہوئیں۔ البتہ حکومت کی ایماء پر ان کتابوں سے میرا نام ہٹا دیا گیا تھا۔ میرا سب سے بہترین ناول "سلیمان اور بلقیس" Solomons and Bilqees ہے جو میں نے قرآن کے مطالعہ کے بعد لکھی۔ اور میرے خیال میں یہ میرا سب سے بہترین ناول ہے۔

<u>سوال: ذہانت اور سیاست کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ ہم ڈاکٹر ملیکا کو ایک مفکر کی حیثیت سے تو جانتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ آیا آپ نے کبھی بعد میں کسی سیاسی پارٹی کی رکنیت بھی اختیار کی؟</u>

<u>جواب:</u> میں نہ تو کبھی کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوئی اور نہ ہی کوئی تہذیبی اور ثقافتی بنیاد پر مبنی گروپ قائم کیا۔ یہ چیزیں ذاتی پسند و ناپسند پر منحصر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کسی گروہ کا حصہ یا ممبر ہوئے بغیر سماج کے ذہین اور سنجیدہ طبقے کو اپنی تحریروں سے زیادہ متاثر کر سکتی ہوں۔ میرے خیال میں سنجیدہ اور ذہین طبقے کو سیاست میں شامل نہیں ہونا چاہئے الا یہ کہ ایسا کرنا ان کے لئے ناگزیر ہو جائے۔

مسلم تنظیموں کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑھے لکھے ممبروں کی اچھی تعداد کو سیاست سے دور رکھے تاکہ کسی بھی طرح کے نامساعد حالات میں وہ اپنے نظریات کی ترویج کا کام منظم طریقے سے ان کے ذریعہ جاری رکھ سکیں۔ قبل اس کے کہ میں آپ کے سوالوں کا جواب دوں یہ بتادینا ضروری سمجھتی ہوں کہ بوسنیا پر سربوں کے حملے کے بعد میں نے اپنے گھر پر جمعہ کو مسلم بچیوں کا اجتماع کرنا جاری رکھا۔ میں ان بچیوں ہمیشہ بتاتی رہی کہ سیاست کو اسلام سے جدا کرنے کا مطلب ہے کہ انسان کے سر کو اس کے تن سے جدا کردیا جائے۔ اسلام دنیا میں قیادت کے لئے آیا ہے نہ کہ اتباع کے لئے۔ اور یہ مہد سے لحد تک ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے۔ دعوت اسلامی کا دائرہ محدود نہیں ہونا چاہئے۔

حال ہی میں میرا ایک ناول "A Garden for all Peoplle" شائع ہوا جس میں نے اس احساس برتری کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور سے یورپین میں پائی جاتی ہے۔ اور میں نے نسلی امتیاز، منتخب قوم کے تصور اور سب سے بہتر تہذیب کے جو جراثیم ان میں پائے جاتے ہیں، ان کے ذہنوں سے ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی میراث نہیں ہے اور نہ وہ کسی تہذیب اور خاص دور سے تعلق رکھتا ہے بلکہ وہ سب کا ہے۔ یہ انسان ہیں جنھوں نے یہ امتیاز اور نسلی تقسیم کے جراثیم پیدا کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حاکم ہے نہ اس کو قربان کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس کے لئے ایسا کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی شاہانہ عظمت کو باقی رکھنے میں متحمل ہے اور اپنی اسی شان کریمی کی وجہ سے وہ بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔

سوال: بحیثیت ایک ممتاز مفکر اس بارے میں عورتوں کے کردار کو آپ کتنا اہم اور ضروری سمجھتی ہیں؟

جواب: یہ سوال پوچھنے کا بہت بہت شکریہ۔ بدقسمتی سے ہماری مسلم عورتوں کو بہت سے عرب اور مغربی ممالک میں محکوم سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں عورتوں کو ہماری حکومتیں زیادہ محکوم بنائے ہوئے ہیں بمقابل ان غیر مسلم عورتوں کے جن کو ان کی حکومتیں اونچے اختیارات سے نوازتی ہیں اور شاید میرے خیال میں عورتوں کی اس حالت کے لئے عوام کے مقابلے میں ہماری حکومتیں زیادہ ذمہ دار ہیں۔ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق پردہ کرنے یا اسلامی احکام پر عمل کرنے کی خاطر خواہ آزادی نہیں ہے۔

اگر کوئی عورت شرعی اصولوں پر قائم رہ کر کام کرنا چاہتی ہے تو اس کو اس کے کام اور تعلیم دونوں سے محروم کردیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی ہے۔ یہ ایسا دور ہے جس میں انسانی قدریں زیادہ پامال ہورہی ہیں۔ مسلم ممالک میں بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کو تعلیم سے بڑی حد تک محروم رکھا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک کم خواندہ نسل مسلم معاشرہ میں پروان چڑھتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری کچھ نسل جو غیر مسلم معاشرہ میں پروان چڑھ رہی ہے یا اسلام کے بارے میں کم واقف ہونے کی وجہ سے غیر مناسب طور پر تنقیدیں بھی کرتی ہے۔ ان ناخواندہ عورتوں کے ذریعہ اسلام کو ہونے والا نقصان اس نقصان کی طرح سے ہے جو عام طور سے غیر مسلم استانیوں کی وجہ سے اسلام کو پہنچتا ہے۔

سوال: دیکھا یہ جاتا ہے کہ مسلم عورتوں کا عام طور سے حکمراں کے ذریعہ استحصال کیا جاتا ہے یا ان کو ان کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلم عورتوں کو کیا کرنا چاہئے؟

جواب: پردہ اسلام کا مقدس حکم ہے۔ ترکی میں مسلم عورتیں مشکل حالات سے دوچار ہیں اور مسلم ہونے کی ان کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ البتہ انھوں نے ثابت کردیا ہے کہ وہ اپنے ایمان کے تئیں مخلص ہیں۔ انھیں کوئی پردہ استعمال کرنے پر مجبور نہیں کرتا ہے اور کچھ تو غیر مسلم خاندان سے تعلق رکھتی ہیں لیکن سب پردہ استعمال کرتی ہیں اور ان کی اس سلسلے میں مدد کی جانی چاہئے۔ میں اپنی بہنوں کو صبر کی تلقین کرتی ہوں۔ میں مسلم عورتوں کے جذبات سے اچھی طرح سے واقف ہوں اس لئے کہ مجھ کو جیل میں قید کیا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں بھی دی گئیں۔ جیل میں لوگوں نے مجھے میرے سر سے پردہ ہٹانے کی دھمکی دی تھی مگر میں نے ان سے کہا کہ میرے سر سے پردہ تو ہٹا سکتے ہو لیکن میرے دل اور دماغ سے میرے عقیدے کو نہیں ہٹا سکتے۔ ایسے موقع پر میں اپنی ان مسلم بہنوں سے کہنا چاہوں گی جو ایک قدامت پسند ماحول میں رہتی ہیں کہ پردہ کرنا جاری رکھیں اس لئے کہ پردہ ایک انسان کے اخلاقی پہلو اور سوچ کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ ایک مقدس حکم کا بجالانا ہے، ایک مذہبی علامت ہے اور ایک پاکیزہ معاشرے کی صحیح تصویر ہے۔ یہ ایک مسلم عورت کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔ ان چیزوں کو ذہن میں لائے بغیر پردہ محض ایک کپڑے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

سوال: کچھ لوگ عورتوں کے تعلق سے ناانصافی پر گفتگو کرتے ہیں جس سے دنیا کے مختلف

سوال: میں عورتیں دو چار ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلم دنیا میں عورتوں کے ساتھ قدرے بہتر سلوک ہوتا ہے۔ آپ کی مسلم دنیا میں عورتوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: اس طرح کی تکالیف کی وجہ تین طرح کے لوگ ہیں۔ اول جاہل لوگ، دوم نافرمان لوگ اور سوم ظالم لوگ۔ وہ لوگ جو اسلام کے مقدس احکام پر عمل کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی یہ حدیث بھی سمجھتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے "صرف نیک اور متقی لوگ عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔ برے اور نافرمان لوگ ان کو ذلیل کرتے ہیں" اور دوسری حدیث میں ہے کہ "تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں یا خاندان کے نزدیک بہتر ہیں اور تم میں سب سے بہتر میں ہوں اپنی عورتوں سے تعلق سے" دوسری احادیث اور قرآنی آیات میں عورتوں سے بہتر سلوک کی تلقین کی گئی ہے اور جہاں تک عورتوں کو ایذا دینے یا مارنے کا سوال ہے اسلام اس کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا ہے الا یہ کہ صریح نافرمانی کسی عورت کی جانب سے سرزد ہو جائے جیسے کوئی عورت بلا وجہ اپنے شوہر کو جنسی خواہش کی تکمیل سے روکے۔ البتہ اس طرح سے ان کو نہ مارا جائے کہ کوئی چوٹ یا زخم پڑ جائے۔ میرے جاننے والوں میں ایک برطانوی خاتون بھی ہیں جو اسلام میں عورتوں کے مخصوص مقام سے متاثر ہو کر مسلم ہوئی ہیں۔ جبکہ حال یہ ہے کہ عورتوں کو آج مارا جاتا ہے، ہراساں کیا جاتا ہے، ان کی عزت لوٹی جاتی ہے اور قتل کیا جاتا ہے اور ان کا تجارتی مقاصد کے لئے مختلف جگہوں اور مواقعوں پر فیشن کے نام پر بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے۔

سوال: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی قدروں اور جدید مغربی نظریات و اقدار کے بیچ ایک طرح کی کشمکش پائی جاتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا ماننا ہے؟

جواب: ہمارے اور مغرب کے درمیان کشمکش اب کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کے بجائے اسلام کی دعوت اب زیادہ آسان ہو گئی ہے۔ ہمیں اسلام مخالف الزام کا جواب دینے کے بجائے دعوتی کام پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنی چاہئے اس لئے کہ الزام کا جواب دینے کی وجہ سے ہم کمزور اور دفاعی پوزیشن میں چلے جاتے ہیں۔ ہمیں ان بے جا تنقیدوں کی روشنی میں اپنی سوچ کو وسعت دینی چاہئے اور سب سے پہلے ہمیں اپنی سوچ کو اپنے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور فوجی بندشوں سے آزاد کرنا چاہئے۔ ایک عورت آخر کس طرح سے اپنے آپ کو آزاد تصور کر سکتی ہے اگر دوسرے لوگ اس کے لباس کے بارے

میں فیصلہ کرتے تھیں۔ فیشن پرستی نے عورتوں کی ہر طرح کی ذاتی صلاحیتوں کو ختم کر دیا ہے۔ دوسرے لوگ اس کے بارے میں سوچتے ہیں اور اگر وہ ان کی رائے کو نظر انداز کر دیتی ہیں تو وہ اس کو بیک ورڈ ہونے کا الزام دیتے ہیں اور اپنی خواہشات کی اتباع پر مجبور کرتے ہیں۔

سوال: اس طرح کے چیلنجز کا سامنا مسلم عورتوں کو کس طرح کرنا چاہئے اور وہ کس طرح سے عورتوں کے مقام کا دفاع کر سکتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے؟

جواب: سب سے پہلے میں ان تمام پردہ نشین عورتوں کو سلام کرتی ہوں جو مسلم دنیا میں سلاخوں کے پیچھے دن کاٹ رہی ہیں اور اپنی ان بہنوں کو بھی جنہیں کچھ ممالک میں پردہ استعمال کرنے کی وجہ سے ان کے روزگار اور تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مجھے بھی کچھ اسی طرح کے حالات کا سامنا ہے ایک ایسے ملک میں جہاں پر لاکھوں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا ہے اور جہاں پر عورتوں کی عزت کو بیدردی سے پامال کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں پر قومی لیڈر کوئی کردار ادا نہیں کر پا رہے ہیں اور تمام تر ذمہ داری ان اجنبیوں پر چھوڑ دی گئی ہے جو جمہوریت کو بحال کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یقیناً یہ لوگ نسلی امتیاز پر مبنی جمہوریت ایک خاص گروہ کے لئے قائم کئے ہوئے ہیں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف ان کی اتباع کرنی ہے اور کبھی بھی ان کی طرح خواب دیکھنے کا حق ہم نہیں رکھتے۔ ہم مستقل جدو جہد کی حالت میں ہیں اور ہمیں اپنی یہ کوشش اور جدو جہد جاری رکھنی چاہئے۔ آنے والی نسل کو ایسے جدید اسکالرس، ڈاکٹرس، جرنلسٹ، مصنفین کی شدید ضرورت ہے جو ان کے لئے رول ماڈل بن سکیں۔ ہر زمانے کی اپنی کچھ خوبیاں اور الگ خاص پہچان ہوتی ہے اور میں ایسی ابتدا اور آغاز کو پسند کرتی ہوں جو جدید فکر اور سوچ کے میدان میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر اٹھائے گئے ہوں۔ اپنی نسل کے لئے رول ماڈل پیدا کرو تو مستقبل تابناک ہوگا۔ تمہارا قلم، خون، صبر و استقامت، قربانیاں اور استقلال تمہارے لئے ایک بہتر راستہ ہموار کرے گا۔ قومی وفاداری کے بجائے اپنے رشتے اسلامی بنیاد پر استوار کرو اور اپنی تعلیم پر بھروسہ رکھو اس لئے کہ ہم سائنسی دور میں رہ رہے ہیں۔ اس وقت میری چار کتابیں شائع ہونے جا رہی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل سوئز سفارت خانے نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور بتایا کہ سوئز حکومت آپ کو پناہ دینے اور رہائش کا انتظام کرنے کے لئے تیار ہے البتہ میں نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

بحوالہ (الدعوۃ، الریاض)

مقالات

تاریخ رواۃ

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب
پروفیسر کلیۃ الشریعۃ جامعہ دمشق

فن تاریخ رواۃ وہ علم ہے جو راویوں کے ان پہلوؤں سے متعارف کراتا ہے جو روایت حدیث سے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہوتے ہیں۔ راویوں کے احوال کے بیان میں یہ علم راویوں کی تاریخ پیدائش، وفات، اساتذہ، اپنے اساتذہ سے سماع کی تاریخ، انکے تلامذہ، وطن اور مولد، رحلات اور مختلف شہروں میں ان کی آمد کی تاریخ اور مختلف شیوخ سے اختلاط سے پہلے یا بعد ان کے سماع اور اسی طرح کے دیگر ان امور کا تذکرہ کرتا ہے جن کا امور حدیث سے کسی بھی نوعیت کا ربط ہوتا ہے۔

<u>فن تاریخ کے دیگر اسماء:</u> بعض محدثین اسے ''علم تاریخ'' اور بعض تاریخ رواۃ اور بعض ''وفیات الرواۃ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ پانچویں صدی کے بعد کے اکثر مؤلفین نے اس فن کو ''التواریخ والوفیات'' سے تعبیر کیا ہے۔

<u>نشأت وتطور:</u> اسلام میں روایت کے آغاز کے ساتھ ہی ساتھ اس فن کا بھی آغاز ہوا اور علماء نے اس فن کی جانب توجہ دی تاکہ سندوں میں آئے راویوں کی معرفت ممکن ہو سکے۔ چنانچہ وہ راویوں کی عمروں، وطن اور شیوخ سے ان کے سماع کی تاریخ کے متعلق اسی طرح سوال کرتے تھے جس طرح ان راویوں کے متعلق امانت ودیانت کے لحاظ سے دریافت کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے اس فن کی جانب یہ توجہ اس لئے کی گئی کیونکہ اس کے بغیر سماع کے دعوی کی تحقیق اور سندوں کے اتصال وانقطاع کی معرفت اور نتیجۃً مرفوع ومرسل احادیث کی پہچان ممکن نہ تھی۔

<u>اہمیت:</u> تاریخ رواۃ کا یہ علم کذابوں اور دجالوں کی قلعی کھولنے کے لئے سب سے بہترین ہتھیار تھا۔ سفیان الثوری فرماتے ہیں: ''جب راویوں نے جھوٹ بولنا شروع کیا تو ہم نے اس کے مقابلے کے لئے فن تاریخ کا استعمال کیا'' (الکفایۃ: ۱۱۹)

عفیر بن معدان الکلاعی کہتے ہیں: عمر بن موسیٰ ہمارے یہاں ''حمص'' تشریف لائے۔ مسجد میں ہم لوگ ان کے پاس اکٹھا ہوئے۔ چنانچہ وہ ''حدثنا شیخکم الصالح'' (ہم سے تمہارے نیک بزرگ نے روایت کی) کے ذریعہ حدیثیں روایت کرنے لگے۔ جب بار بار اس جملہ کا اعادہ کیا تو میں نے پوچھا یہ صالح بزرگ کون ہیں۔ فرمایا خالد بن معدان، میں نے کہا کس سن میں آپ کی ان سے ملاقات ہوئی؟ فرمایا: ۱۰۸ھ میں۔ میں نے پوچھا کس جگہ؟ فرمایا: ارمینیہ کے غزوہ میں۔ تو میں نے کہا اے شیخ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جھوٹ نہ بولو۔ خالد بن معدان کا انتقال تو ۱۰۴ھ ہی میں ہو گیا تھا۔ اور تم بیان کر رہے ہو کہ تمہاری ملاقات ان سے ان کی وفات کے چار سال بعد ہوئی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے ارمینیہ کے غزوات میں کبھی حصہ ہی نہیں لیا وہ تو رومیوں کے خلاف جنگ کرتے تھے۔ (الکفایۃ: ۱۱۹)

اس علمی نشاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے پاس راویوں کے تراجم اور اخبار کا ایک بڑا علمی ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جنھیں انھوں نے اپنی کتابوں میں منتقل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے صحابہ، ان کے احوال واخبار، مشاہد اور قبائل، ان کی احادیث کی تعداد اور ان سے روایت کرنے والے تلامذہ کی تحقیق پر بھرپور توجہ لگائی چنانچہ عصر تدوین میں متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں جو صرف صحابہ کے احوال واخبار پر مشتمل تھیں۔ اور اسی طرح تابعین اور تبع تابعین وغیرہ کے احوال وتراجم پر مشتمل مخصوص کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔

البتہ تاریخ رواۃ پر لکھنے والے مؤلفین کے مناہج تالیف مختلف ہیں۔ بعض لوگوں نے طبقات کے لحاظ سے کتب تراجم کو ترتیب دیا ہے اور ہر طبقہ کے بعد دوسرے طبقہ کے راویوں کے احوال کو بیان کیا ہے۔ طبقہ راویوں کی اس جماعت کو کہتے ہیں جنھوں نے تقریباً ایک ہی عصر میں زندگی گذاری ہو۔ طبقات کے لحاظ سے ترتیب دی گئی سب سے قدیم ترین کتاب محمد بن سعد کی ''الطبقات الکبریٰ'' اور خلیفہ بن خیاط العصفری کی ''طبقات الرواۃ'' ہے۔

بعض دیگر سوانح نگاروں نے سنوں کے لحاظ سے راویوں کے احوال بیان کیے ہیں۔ چنانچہ وہ راوی کی وفات کی تاریخ درج کرنے کے بعد اس کی مختصر سوانح حیات اور اس کے احوال وکوائف بیان کرتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے اپنی مشہور تصنیف ''تاریخ الاسلام'' میں یہی اسلوب اپنایا ہے۔

بعض علماء نے راویوں کے تراجم حروف معجم کے لحاظ سے ترتیب دیئے ہیں۔ اس نوع کی کتابیں ریسرچ اسکالروں اور محققین کے لئے زیادہ کارآمد ہیں کیونکہ ان میں ترجموں تک رسائی بے حد آسان ہوتی ہے۔ اس نوع کی سب سے قدیم ترین کتاب جو ہم تک پہنچی ہے وہ امام محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴-۲۵۶ھ) کی "التاریخ الکبیر" ہے۔

رواۃ حدیث کے تراجم پر سب سے جامع کتاب حافظ شہاب ابوالفضل احمد بن علی (ابن حجر) العسقلانی کی کتاب "تہذیب التہذیب" ہے جو ہندوستان سے ۱۳۲۵ھ میں بارہ جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ اصلاً یہ کتاب جمال الدین المزی کی کتاب "تہذیب الکمال فی أسماء الرجال" کی تلخیص ہے جو بارہ جلدوں میں تھی نیز متعدد علمی فوائد اور نکات کا اضافہ بھی ہے۔ اور مزی کی یہ کتاب اصلاً حافظ ابو محمد عبد الغنی بن عبدالواحد المقدسی کی کتاب "الکمال فی أسماء الرجال" کی تہذیب وشرح ہے۔

ابن حجر نے پھر "تہذیب التہذیب" کی بھی تلخیص کی ہے جو "تقریب التہذیب فی أسماء الرجال" کے نام سے موسوم ہے اور دو جلدوں میں قاہرہ سے ۱۳۹۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔

تراجم کی یہ کتابیں ان کتابوں کے علاوہ ہیں جو علماء نے مختلف شہروں کے لحاظ سے ترتیب دی ہیں۔ چنانچہ اس نوع کی کتابوں میں مؤلف کسی بھی شہر کے علماء، وہاں آنے والے شیوخ اور بسا اوقات اس شہر کے علماء سے استفادہ کرنے والوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اور عموماً مؤلفین اس نوع کی کتابوں میں اس مخصوص شہر کے فضائل، وہاں سکونت اختیار کرنے والے یا رہنے والے یا گزرنے والے صحابہ کا تذکرہ کرتے ہیں پھر بقیہ علماء کا حروف معجم کے لحاظ سے ذکر کرتے ہیں۔

اس نوع کی سب سے قدیم ترین کتاب امام محمد بن عبداللہ الحاکم النیساپوری کی "تاریخ نیساپور" ہے۔ یہ کتاب تاریخ کی عظیم ترین کتابوں میں سے ہے اور علماء کے لئے بے حد سودمند ہے۔ اور خطیب البغدادی کی کتاب "تاریخ بغداد" انتہائی عظیم اور بے حد نفع بخش کتاب ہے۔ اور ابن عساکر (علی بن الحسین) کی "تاریخ دمشق" ۸۰ جلدوں میں انتہائی عظیم اور جامع کتاب ہے۔

محدثین نے صرف انھیں انواع پر بس نہ کیا بلکہ راویوں کے اسماء، القاب، انساب، کنیتوں، ملتے جلتے اسماء و القاب، نیز کنیتوں اور انساب، معمر صحابہ و تابعین، مشتبہ ناموں کی تعیین و توضیح کے لحاظ

سے بھی کتابیں تالیف فرمائی ہیں جو ان کے اس فن کے ساتھ بے حد اہتمام و توجہ نیز اس فن پر ان کی مہارت تامہ و رسوخ پر دلالت کرتی ہیں۔

چنانچہ ناموں اور کنیتوں کے لحاظ سے ترتیب دی گئی کتابوں میں سب سے قدیم ترین کتاب علی بن عبداللہ المدینی کی "الأسامی والکنی" ہے۔ اور اس نوع کی سب سے جامع ترین کتاب "الکنی والاسماء" ابوبشر محمد بن احمد الدولابی کی ہے جو ہندوستان سے ۱۳۲۲ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

امیر ابو نصر علی بن ھبۃ اللہ (ابن ماکولا) البغدادی (۴۸۶ھ) کی کتاب "الاکمال فی رفع الارتیاب عن المؤتلف و المختلف من الأسماء و الکنی و الأنساب" انتہائی عمدہ کتاب ہے۔ مؤلف نے اس میں درج ذیل مشہور و متداول کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

"المؤتلف و المختلف فی أسماء نقلة الحدیث" اور "المشتبة فی النسبة" امام عبدالغنی بن سعید الاسدی المصری (۴۰۹)، تکملة المؤتلف و المختلف، الأسماء و الألقاب، الأسماء المبهمة في الأنباء المحكمة اور تلخیص المتشابة في الرسم في أسماء الرواة، خطیب البغدادی (۴۶۳ھ)

یہ کتاب دو جلدوں میں ہندوستان، ترکی اور عراق سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں (۸ مصطلح) کے رقم کے ساتھ موجود ہے۔

مشتبہ ناموں پر سب سے جامع کتاب حافظ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی (۷۴۸ھ) کی "المشتبہ فی أسماء الرجال" ہے۔ دو جلدوں میں متعدد طبعات اس کے منظر عام پر آچکے ہیں۔ آخری طبعہ ۱۹۶۲ء میں قاہرہ سے علی محمد البجاوی کی تحقیق کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔

راویوں کے القاب پر سب سے جامع کتاب ابن حجر العسقلانی کی "نزھۃ الالباب فی الالقاب" ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں "۳۳۶ مصطلح" کے نمبر کے تحت موجود ہے۔

انساب پر سب سے جامع کتاب تاج الاسلام عبدالکریم بن محمد السمعانی (۵۶۲ھ) کی "الأنساب" ہے۔ یہ کتاب حروف معجم کے لحاظ سے مرتب ہے۔ مشہور مستشرق مارغلیوث کی تحقیق کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۱۲ء میں لیڈن سے شائع ہوئی ہے۔

"الأنساب" کی تلخیص علی بن محمد الشیبانی نے "اللباب" میں کی ہے۔ اس میں اضافے بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب تین جلدوں میں مصر سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی تلخیص امام سیوطی نے "لب اللباب فی تحریر الانساب" کے نام سے کی ہے جو لیڈن سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علماء نے صرف رواۃ حدیث کے احوال و کوائف بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان عورتوں کے تراجم بھی ذکر کیے ہیں جنھوں نے علمی زندگی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ چنانچہ محمد بن سعد الواقدی نے اپنی مشہور کتاب "الطبقات الکبریٰ" کی آخری جلد عورتوں کے تراجم کے لیے خاص کیا تھا اور آپ کی اقتداء کرتے ہوئے اکثر مصنفین نے اس روش کو اپنایا تھا۔

چودہ صدی پہلے جب پوری انسانیت جہل و تاریکی کے سایوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی اور جب عورت یورپ میں صرف نوکرانی سمجھی جاتی تھی اس وقت انسانی تہذیب و تمدن کی بنا رکھنے میں مسلمان مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔

تاریخ رواۃ پر کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ میرے پاس تین سو سے بھی زائد کتابیں اس فن پر موجود ہیں جن میں سب سے چھوٹی کتاب ایک یا دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اوسط درجے کی کتابیں تین سے لے کر دس جلدوں پر اور مبسوط و مفصل کتابیں دس جلدوں سے بھی زیادہ اجزاء پر مشتمل ہیں حتی کہ بعض کتابیں ستر یا اس سے بھی زائد اجزاء پر مشتمل ہیں جیسے ابن عساکر کی تاریخ دمشق۔

تاریخ رواۃ پر لکھی گئی کتابوں پر اگر انصاف کے ساتھ نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح ہر باحث پر عیاں ہوگی کہ مسلم علماء نے سنت کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ اور نقلی علوم میں بحث و تحقیق اور تثبت و احتیاط کے بالکل نادر و نرالے اصول پیش کیے ہیں جن کے عمدہ ثمار آج تک باقی ہیں اور ان شاء اللہ تا قیامت باقی رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

مقالات

توریت میں بشارات محمدیہ ﷺ

(۳)

ابوطوبیٰ فلاحی

پانچویں بشارت: کتاب پیدائش میں ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے آپ کے بیٹے اسماعیل کے حق میں یہ وعدہ فرمایا تھا "اور اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے ایک بڑی قوم کے لیے بناؤں گا۔" (باب ۱۹/۳۰-۲۰)

اس بشارت میں "میں اسے ایک بڑی قوم کے لیے بناؤں یا پیدا کروں گا" محمد عربی ﷺ کی جانب اشارہ ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کی نسل و ذریت میں محمد عربی ﷺ کے علاوہ کوئی اور بڑی قوم کے لیے مبعوث یا پیدا نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں محمد عربی ﷺ کے حق میں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا یوں نقل کی گئی ہے:

"ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلو علیھم آیاتك و یعلمھم الکتاب و الحکمة و یزکیھم انك أنت العزیز الحکیم"

(سورة البقرة : ۱۲۹)

"اے ہمارے رب تو ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیج جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے یقیناً تو غالب اور حکیم ہے۔"

امام قرطبی لکھتے ہیں: عبرانی زبان و ادب کے ماہرین کا خیال ہے کہ توریت کی مذکورہ بالا عبارت میں عدد کے ذریعہ یہودیوں کے استعمال کے لحاظ سے دو جگہ محمد عربی ﷺ کا نام مذکور ہے۔

[۱] "بہت" کا لفظ جسے عربی میں "جدا جدا" اور عبرانی میں "بماد ماد" کہا جاتا ہے۔ ان

حروف کی تعداد "۹۲" ہے کیونکہ باء کا نمبر دو، میم چالیس، الف ایک، دال چار، دوسری میم چالیس، الف ایک اور دال کا نمبر چار ہے اور اسی طرح "محمد عربی ﷺ" میں میم چالیس، حاء کا عدد آٹھ، میم چالیس اور دال کا نمبر چار ہے۔

حروف کے اعداد کے لحاظ سے معانی و مفاہیم کی تعیین یہودیوں کے یہاں مستعمل تھی۔ اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو مدینہ میں آباد یہودی قبائل کے بعض احبار سے مروی ہے کہ قرآن مجید میں مستعمل حروف مقطعات امت اسلامیہ کی مدت بیان کرنے کے لئے آئے ہیں۔

[۲] دوسرا لفظ "ایک بڑی قوم کے لئے" ہے جسے عبرانی میں "لغوی غدول" کہتے ہیں۔ یہودیوں کے نزدیک لام تیس، غین تین (کیونکہ غین ان کے یہاں جیم کے مقام پر ہے کیونکہ عبرانی میں جیم اور صاد نہیں ہے) واو چھ، یاء دس، دوسرا غین تین، دال چار، واو چھ اور لام کا عدد تیس ہے۔ اور مجموعی تعداد ۹۲ ہوئی۔

عبدالسلام یہودیوں کے بڑے علماء میں سے تھے جو سلطان بایزید خاں مرحوم عثمانی کے عہد میں اسلام لائے اور ایک رسالہ "الرسالۃ الھادیۃ" کے نام سے تصنیف فرمایا۔ آپ اس رسالہ میں رقمطراز ہیں کہ اکثر علماء یہود حروف ابجد کے لحاظ سے حروف کی عدد کے قائل ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو علماء یہود اکٹھا ہوئے اور انھوں نے یہ پیشن گوئی کی کہ یہ عمارت چار سو دس سال باقی رہے گی پھر برباد ہو جائے گی اور اس پیشن گوئی کا ماخذ توریت میں وارد لفظ "بزأت" میں حروف کی تعداد تھی۔

البتہ علماء یہود نے "بماد ماد" پر یہ اعتراض کیا کہ باء کلمہ کے اصلی حروف میں سے نہیں ہے بلکہ یہ حرف وصل ہے اور اگر اسے کلمہ سے نکال دیا جائے تو اسم محمد کی جانب اشارہ کے لئے ایک دوسرے اصلی باء کی ضرورت پڑے گی۔

جواباً عرض ہے کہ یہودیوں کے یہاں جب دو باء اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ ایک اصلی اور دوسرا حرف وصل ہو تو حرف وصل کو حذف کر دیتے ہیں اور مادہ کے حرف کو باقی رکھتے ہیں۔

چھٹی بشارت: کتاب حجی میں ہے "میں سب قوموں کو ہلا دوں گا اور ان کی مرغوب

چیزیں آئیں گی اور میں اس گھر کو جلال سے معمور کروں گا۔ رب الافواج فرماتا ہے" (باب ۲/۷)

اس آیت میں وارد لفظ "مرغوب" عبرانی میں "حمدث" اور عربی میں "حمد" آیا ہے۔ اس سے محمد ﷺ کی نسبت بشارت نکلتی ہے۔ ریورنڈ مسٹر پرکہرسٹ حمد کے مادہ کی نسبت کہتے ہیں کہ "ہر قسم کی پاک چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے" اسی مادہ سے محمد، احمد اور حامد اور محمود ہمارے پیغمبر خدا ﷺ کے نام مبارک نکلے ہیں اور اس بشارت میں لفظ "حمدث" کے کہنے سے صاف اشارہ ہے کہ جس شخص کے مبعوث ہونے کی اس میں بشارت ہے وہ ایسا شخص ہے کہ اس کا نام حمد کے مادہ سے مشتق ہے اور وہ کوئی نہیں سوائے محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے۔

عیسائی پادریوں کا خیال ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے کی ہے مگر یہ خیال دو وجہ سے صحیح نہیں ہے:

اول اس لئے کہ حضرت متی نے جس قدر بشارتیں عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہیں ان سب کو بالتفصیل اپنی انجیل میں لکھا ہے کیونکہ وہ انجیل عبرانی زبان میں یہودیوں کی ہدایت کے لئے لکھی گئی تھی اور اسی سبب سے تمام بشارتیں جو توریت و زبور و صحف انبیاء میں حضرت عیسیٰ کی نسبت تھیں ان سب کو حضرت متی نے لکھا تھا مگر اس بشارت کا ذکر حضرت متی نے نہیں کیا۔ اگر یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہوتی تو ضرور حضرت متی اس کا ذکر کرتے۔

دوسرے یہ کہ حمد کے مادہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر کسی طرح اشارہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اشارہ خاص اسی شخص کے نام کا ہے جس کا نام اسی مادہ سے مشتق ہوتا ہے اور اس لئے بشارت حضرت عیسیٰ کی نہیں ہے بلکہ اس کی بشارت ہے جس کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی کہ "یأتی من بعده اسمه أحمد"۔

ساتویں بشارت: حضرت یسعیاہ نبی وحی کی رو سے ان لوگوں کا ذکر جو خدا کی سچی پرستش از سر نو قائم کریں گے اس طرح کرتے ہیں: "اور ایک جوڑی سواروں کی دیکھی ایک سوار گدھے کا اور اونٹ کا اور خوب متوجہ ہوا" (کتاب یسعیاہ باب ۲۱/۷)

اس آیت میں حضرت یسعیاہ نبی نے دو شخصیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو خدا کی سچی پرستش

اور وہ قائم کریں گے۔ ان میں سے ایک کو گدھے کی سواری کے نشان سے بتلایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جناب ممدوح گدھے پر سوار ہو کر بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے اور بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کی سچی پرستش قائم کی اور یہودیوں نے جو مکاری اور دغا بازی سے شریعت کے صرف ظاہری احکام کی ریاکاری سے پابندی اختیار کی تھی اور دلی نیکی اور روحانی پاکیزگی کو بالکل چھوڑ دیا تھا اس کو مٹایا اور سچی پرستش خدا کی قائم کی۔

دوسرے شخص کو اونٹ کی سواری کے نشان سے بتلایا اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس سے حضرت محمد رسول اللہ کی طرف اشارہ ہے جو عرب کی خاص سواری ہے۔ بچے سے بوڑھے تک اور عالم سے جاہل تک جس چاہو پوچھو اونٹ کا نام لیتے ہی عرب کا اشارہ سمجھ جاوے گا۔ اور جب رسول خدا ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو اونٹ پر سوار تھے اور بلاشبہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدائے واحد کی پرستش قائم کی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد جو لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانا اور تین خدا قائم کر کر پھر تین سے ایک خدا بنایا تھا اور خدائے واحد کی پرستش میں خلل آ گیا تھا اس کو مٹایا اور پھر سے خدا کی سچی پرستش قائم کی اور یوں فرمایا:

”یا أهل الکتاب تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا و بینکم أن لا نعبد الاّ الله“

☆☆☆☆☆

مقالات

جامعۃ الفلاح کا قیام

ڈاکٹر غلام نبی تیلی

ترجمہ: عبدالرحمٰن زریاب فلاحی

ہندوستانی مسلمانوں نے تحصیل و اشاعت علم کے لئے تاریخ کے ہر دور میں مخلصانہ اقدامات کیے ہیں۔ انھوں نے اسے اپنا مقدس فریضہ سمجھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے مدارس قائم کیے اور تعلیم کی تبلیغ و ترسیل و رہنمائی عطا کرنے سے کبھی اغماض نہیں برتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے زمانہ حکومت میں کوئی ایک بھی گاؤں یا بستی ایسی نہیں تھی جہاں ملت کے نونہالوں کو بنیادی مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے کوئی اسکول یا مکتبہ موجود نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ حفظ قرآن اور عربی صرف و نحو کی روشنی میں قرآن کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

قصبہ بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی انڈیا کا بھی بالکل یہی معاملہ تھا۔ یہاں سنہ ۱۹۱۲ء سے ایک مکتبہ معروف بہ ”مکتبہ اسلامیہ“ اپنے فرائض منصبی ادا کر رہا تھا جس میں درجہ دوم کے معیار کی تعلیم کا نظم تھا۔ مکتبہ کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس کی تاسیس قصبہ بلریا گنج کے دو شرفاء محترم علی احمد خاں اور منشی لال محمد خاں کے ہاتھوں سنہ ۱۹۱۲ء میں عمل میں آئی جنھیں قصبہ کے تمام ہی باشندگان کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ اس مکتبہ کے معلم اول ہونے کا شرف منشی لال محمد کو حاصل ہوا اور علی احمد خاں صاحب مہتمم منتخب ہوئے۔ مکتبہ کا آغاز ولی محمد خاں کے رہائشی مکان میں ہوا اور دو سالوں کی ایک آزمائشی مدت تک مکتبہ وہیں سے فرائض منصبی کو ادا کرتا رہا۔

موجودہ مودودی ہاسٹل کے جنوب میں مقامی حضرات کے تعاون و اشتراک سے مٹی اور کھپریل کی ایک عمارت ۱۹۱۶ء میں تعمیر کی گئی۔ اس اولین عمارت کی تکمیل کے بعد مکتبہ اسلامیہ کو ولی محمد

خاں کے گھر سے یہاں منتقل کر دیا گیا۔

علی احمد خاں صاحب نے مکتبہ اسلامیہ کے منیجر کی حیثیت سے ۱۹۱۳ء سے لیکر ۱۹۲۷ء تک یعنی کل تیرہ سال خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے منیجمنٹ کی ذمہ داری اپنے صاحب زادے محمد حنیف خاں کے کندھوں پر ڈال دی اور خود سفر حج پر روانہ ہو گئے اور وہیں مالک حقیقی سے جا ملے۔

محمد حنیف خاں نے اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سخت جدوجہد کا مظاہرہ کیا اور بڑے شوق سے مکتبہ کی خدمت کی۔ مکتبہ اسلامیہ کو ان کی سرپرستی پورے ۲۷ سال ۱۹۲۷-۵۴ء تک حاصل رہی۔ ان کی نظامت کے دوران مکتبہ اسلامیہ نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ اپنی سرگرم نظامت کی وجہ سے وہ اتنا مقبول ہوئے کہ قصبہ اور گرد و پیش کے لوگ انھیں حقیقی نام کے بجائے "منیجر صاحب" کے نام سے کہیں زیادہ جاننے لگے۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں آپ نے بھی ادائے فریضہ حج کے لئے رخت سفر باندھا اور جاتے جاتے مکتبہ اسلامیہ کی پوری دیکھ بھال کی ذمہ داری حاجی امانت اللہ صاحب کے حوالے کر دی۔ لیکن انتہائی مختصر عرصہ کے بعد ہی حاجی عبدالمجید خاں عرف میاں جی مجید ولد صاحب علی خاں نے مکتبہ اسلامیہ کی ذمہ داری سنبھالی۔

مکتبہ اسلامیہ کو دوسرا مخلص استاذ منشی علی خاں کی شکل میں نصیب ہوا جنھوں نے ۱۹۵۹ء تک جب مکتبہ اسلامیہ، مدرسہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوا، اپنی عظیم خدمات سے بہرہ ور کیا۔ مکتبہ اسلامیہ کو دوسرے مشہور و مخلص اساتذہ کی خدمات جلیلہ بھی میسر رہیں۔ ان اساتذہ میں مولوی اسحاق [کوہنڈہ]، مولوی خلیل [میراج گنج]، حافظ لطف اللہ [انجان شہید]، نظیر احمد [میراج گنج] اور مولوی عبدالستار سبھی ضلع اعظم گڑھ کے باشندے۔ شامل ہیں۔ مزید دو مشہور استاذ محترم مجاہد الدین [میراج گنج] اور حافظ جی [کوہنڈہ] بھی ۱۹۳۷ء کے پہلے کے اسٹاف میں شامل تھے۔ ۱۹۳۷ء میں محترم مولوی محمد ادریس صاحب کا بحیثیت استاذ تقرر ہوا اور انھوں نے پہلے مکتبہ اسلامیہ اور مدرسہ اسلامیہ اور آخر میں جامعۃ الفلاح کی ۱۹۹۵ء تک مسلسل ۵۸ سال تک خدمت کی۔

بلریا گنج کا مکتبہ اسلامیہ جلد ہی مکتبہ اسلامیہ کے نام سے تسلیم شدہ ہو گیا اور اسے مالی اعانت بھی حاصل تھی۔ ۱۹۳۰ء میں یہاں ضلع اعظم گڑھ کے نصیر پور، بنگالی پور، شہاب الدین پور اور بلریا گنج

قصبے کے تقریباً ۳۰ طلبہ کا اندراج تھا۔

مکتبہ اسلامیہ ۱۹۵۶ء تک ایک اسکول کی حیثیت سے باقی رہا۔ عام توقع کے مطابق ۱۹۱۳-۵۶ء تک اپنے ۴۳ سالہ زمانے میں یہاں بسا اوقات درجہ پنجم کے معیار کی تعلیم کا نظم تھا۔ بدقسمتی سے حکومت کے تعلیمی شعبہ کے نمائندہ نے اپنے دورے پر مکتبہ کے منیجر کو مشورہ دیا کہ سرکاری اسکول کی موجودگی میں مکتبہ کو درجہ پنجم تک چلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ درجہ دوم اور سوم تک کے طلبہ کو اردو، فارسی اور ریاضی کی بنیادی معلومات مکتبہ میں دی جا سکتی ہے اور پھر انھیں آسانی سے سرکاری اسکولوں میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز مکتبہ اسلامیہ کی ترقی میں مانع ثابت ہوئی۔

بہر حال قصبہ کے لوگوں کی انتہائی جدوجہد اور سعی و کوشش سے مکتبہ اسلامیہ آہستہ آہستہ اپنے حصول مقصد کے لئے مسلسل سرگرم عمل رہا۔ اسکول کے نظم و نسق اور انتظام کا تصور اس دوران بڑا آسان تھا۔ کیونکہ اسکول کو چلانے کے لئے نہ تو کوئی منتظمین کی جماعت تھی اور نہ کوئی ورکنگ کمیٹی۔ مکتبہ کا منیجر ہی تنہا تمام معاملات میں ذاتی طور سے جوابدہ تھا۔ انتظامی امور، اساتذہ کا تقرر، فنڈ کی فراہمی اور مالیات کے لئے چندہ وغیرہ کے معاملات سب منیجر سے متعلق تھے۔ یعنی نظم و نسق سے متعلق تمام ہی معاملات منیجر کے اختیار میں ہوتے تھے۔ اپریل یا مئی کے مہینے میں سال میں ایک بار عام مقامی مجلس یا پنچایت کے سامنے حسب معمول مکتبہ کے آمد و خرچ کا حساب منیجر کے ذریعہ پیش کیا جاتا تھا۔

مکتبہ اسلامیہ میں تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ ٹیوشن فیس طلبہ سے کچھ بھی نہیں لی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے میں تقریباً ۱۰۰ طلبہ مکتبہ میں زیر تعلیم تھے۔ ذرائع آمدنی کا جہاں تک تعلق ہے تو کچھ تعاون مکتبہ کو حکومت سے مل جاتا تھا جب کہ بقیہ اخراجات عوامی چندے اور خصوصاً چنگی کے مرہون منت تھے۔

ایک سرکاری پرائمری اور ثانوی اسکول کے ہونے کے باوجود قصبہ بلریا گنج میں مکتبہ اسلامیہ کے تعاون کے وجود سے ان لوگوں کی زیرکی، دانائی، دلچسپی اور دور اندیشی کا پتہ چلتا ہے جو دینی تعلیم کی قدر و منزلت سے واقف تھے۔ ان دنوں مکتبہ کو عموماً "کچے اسکول" جب کہ سرکاری اسکولوں کو "پکے اسکول" کے ناموں سے جانا جاتا تھا۔ تقریباً تمام ہی مسلم بچوں کو پہلے کچے اسکولوں میں داخل کیا جاتا

تھا۔ درجہ دوم تک کی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ کچے اسکول کا رخ کرتے تھے۔ لیکن مکتبہ کی تعلیم کی غرض وغایت بچوں کو عقائد اسلامیہ کا بنیادی علم پہنچانا اور انھیں قرآن مجید پڑھنے کے قابل بنانا ہوتا تھا۔

مدرسہ اسلامیہ: ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء ہندوستان کی اسلامی تعلیم کے لئے عموماً اور تاریخ اعظم گڑھ کے لئے خصوصاً ایک اہم اور تاریخی دن تھا۔ یہ وہ دن ہے جب ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ بلریا گنج میں ایک عام اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ ایک کھلے خط کے ذریعہ لوگوں کو دعوت شرکت دی گئی۔ خط کا مضمون حسب ذیل تھا:

" ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو بعد نماز عشاء شیخ محمد ادریس صاحب کی رہائش گاہ پر عام میٹنگ منعقد ہوگی۔ بلریا گنج کے تمام ہی نوجوان و بزرگ حضرات سے شرکت کی پر خلوص درخواست ہے۔ اس میٹنگ میں درج ذیل تین حضرات کی شرکت لازمی ہے۔ اس میٹنگ میں تین اہم امور پیش کئے جائیں گے اور ان پر بحث ہوگی۔ [۱] مدرسہ کے لئے ایک انتظامیہ کی تشکیل [۲] اساتذہ کے تقرر پر غور و خوض [۳] نصاب وکورس کی تعیین۔ "

خط کے اندر ۵۲ اشخاص کے ناموں کا ذکر ہے جس میں سے ۳۹ نام خط کے سامنے والے حصہ میں مذکور ہیں بقیہ نام پشت پر لکھے ہیں۔ خط میں ۵۲ اشخاص میں سے ۳۰ کے مکمل ومختصر دستخط بھی موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہی اشخاص تک خط کو پہنچایا گیا تھا اور نتیجے میں انھوں نے وصولیابی کی اطلاع کے طور پر اپنے دستخط بھی ثبت کر دیے تھے۔ عام لوگوں کے مطابق خط کا مسودہ مولوی محمد ابراہیم صاحب کے ذریعہ بنایا گیا تھا۔

پروگرام کے مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو بلریا گنج میں عام اجلاس منعقد ہوا جس میں مدرسہ اسلامیہ کی نشو ونما وترقی اور مذہبی و اسلامی علوم کی تقویت وتائید کو وقت کی ضرورت سمجھا گیا۔ اس رسمی اجلاس میں حسب ذیل اہم فیصلے لئے گئے:

[۱] مکتبہ اسلامیہ یا اسلامی مکتب کے بجائے ادارہ کو مدرسہ اسلامیہ کا نام دیا گیا۔

[۲] دو کمیٹی: ایک انتظامیہ اور دوسری تعلیمی کی تشکیل عمل میں آئی۔

انتظامیہ کے لئے ۱۱ ممبران کا انتخاب ہوا۔ یہ ممبران درج ذیل ہیں:

[۱] قمر الدین [۲] عبد المجید خاں [۳] عبد الجبار خاں [۴] مجیب الحق [۵] حاجی بشیر خاں [۶] شیخ محمد ادریس [۷] مرزا عبد القدوس [۸] امانت اللہ [۹] شیخ ملتان [۱۰] منشی نوجدار [۱۱] منشی رحمت اللہ خاں

جبکہ پانچ ممبران: بابو فرید خاں، عبد المتین خاں، عبد المجید خاں (ماسٹر)، مولوی محمد ابراہیم اور حکیم محمد ایوب صاحب تعلیمی کمیٹی کے لئے منتخب کیے گئے۔ حاجی عبد المجید خاں صاحب مدرسہ اسلامیہ کے ناظم اعلیٰ کے منصب عظیم پر فائز ہوئے۔

اسی اجلاس میں ایک مختصر دستور کی تشکیل بھی عمل میں آئی جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے:

[۱] مجلس انتظامیہ و مجلس تعلیمی کی ہر میٹنگ کی صدارت ناظم جامعہ کریں گے۔

[۲] مجلس تعلیمی صرف تعلیمی امور کی نگرانی کرے گی۔ جبکہ دیگر امور مثلاً آمد وخرچ، اساتذہ کا تقرر و بحالی وغیرہ انتظامیہ کے ذمہ ہوں گے۔

[۳] مجلس تعلیمی کے ممبران انتظامیہ میں بھی شامل کیے جائیں گے۔

[۴] دونوں کمیٹیاں ضرورت پڑنے پر قصبہ کے کسی بھی فرد سے رائے مشورہ کر سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں ایجنڈے کے مطابق شرکاء اجلاس کے سامنے تین نام پیش کیے گئے لیکن دستیاب ریکارڈ کے حوالے سے ان میں سے کسی کا انتخاب نہیں ہو سکا۔

دستور مختصر ضرور ہے لیکن ہے بڑا اہم۔ کیونکہ یہی وہ پہلا دستور ہے جو آج چند حذف واضافہ و ترمیم کے بعد دستور جامعۃ الفلاح کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دستور العمل کی تیاریاں، کمیٹیوں کی تشکیل اور علامۃ الناس کو اعتماد میں لینے جیسی چیزیں ان لوگوں کے شوق ومحبت کی دلیل ہے جو مذہبی و اسلامی علوم کے خوگر تھے اور عوام میں اس کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلریا گنج کے لوگ مذہبی تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ اسلامی علوم میں درک رکھنے والے طلبہ / افراد تیار کرنا ان لوگوں کا خواب عزیز تھا۔ مدرسہ کی نشو ونما وترقی کے لئے یہ حضرات بالکل شروع ہی سے فکرمند رہا کرتے تھے۔

۱۹۵۶ء سے مدرسہ اسلامیہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اسی سال مدرسے میں درجہ سوم کا

۱۹۵۶–۱۹۵۷ء میں درجہ چہارم اور ۱۹۵۸ء میں درجہ پنجم کا بھی اضافہ ہوا۔ طلبہ کا پہلا گروپ پنجم پاس کر کے ۱۹۵۸ء میں یہاں سے نکلا۔

اپنی ترقی کے اس بالکل ابتدائی دور میں بھی مدرسہ اسلامیہ کو محترم مولوی ادریس صاحب بنگالی پور، منشی محبوب علی خاں صاحب بلریا گنج، مولوی خلیل صاحب غازی پور، مولوی عبد القدوس صاحب بھیرہ پور، مولانا محمد عبد الرؤف قاسمی صاحب مبارک پور، محمد احمد صاحب اور منشی محمد انور صاحب بلریا گنج جیسے منتخب اساتذہ کی عظیم خدمات حاصل رہیں۔

ان تمام ہی اساتذہ نے اپنے فرائض منصبی کو بڑی جانفشانی سے ادا کیا اور مدرسہ اسلامیہ کو اسلامی تعلیم کا آئیڈیل ادارہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

محترم مولوی محمد ادریس صاحب ۱۹۳۲ء اور منشی محبوب علی خاں صاحب ۱۹۳۶ء سے بحیثیت استاذ مدرسہ کی خدمت کر رہے تھے اور ادارے کی بے لوث خدمت کے لئے عامۃ الناس میں کافی مشہور تھے۔ محمد عارف خاں نے مدرسہ کی ترقی کے آغاز کو مولوی خلیل صاحب غازی پوری سے منسوب کیا ہے جیسا کہ اپنے غیر مطبوعہ مضمون میں انھوں نے بحث کی ہے۔

" مولوی خلیل صاحب جامعہ نسیم صبح کی طرح آئے اور گلشن جامعہ میں ایک نیا پھول لہرانے لگا۔ طلبہ کی سرگرمیوں میں ایک نیا رخ نظر آنے لگا۔ ان کی آمد سے قصبہ کی گلیوں میں 'اے میرے جانباز کھلاڑی، کھینچے جا تو اپنی گاڑی' کا نعرہ گونجنے لگا اور خوب مقبول ہوا۔ بڑوں نے بچوں کا ساتھ دیا اور نوجوانوں میں تحریکی روح بیدار ہوگئی۔ بس کیا تھا ہفتہ واری پروگرام اور اجتماعات وجود میں آئے۔"

جامعہ اسلامیہ: ۱۹۵۹ء میں بلریا گنج و اطراف کے باشندگان کو عموماً اور انتظامیہ و تعلیمی کمیٹی کے ممبران کو خصوصاً مدرسہ کی توسیع کی ضرورت کا احساس ہوا۔ لہٰذا اسی کے پیش نظر کمیٹی میٹنگ اور جلسے ہوئے۔ قصبہ بلریا گنج کے بعض شرکاء مثلاً محترم عبد المجید خاں، محترم حکیم محمد ایوب، محترم منشی فوجدار، محترم مولوی محمد ابراہیم، محترم حاجی عبد المتین، محترم حاجی امانت اللہ، محترم قمر الدین، محترم محمد اکرام پردھان اور دوسرے بہت سے لوگوں نے توسیع مدرسہ کے لئے کوشش کیں۔ علاوہ ازیں محترم ڈاکٹر خلیل صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں BUMS کی تکمیل کے بعد ۱۹۵۶ء میں آبائی وطن واپسی کے بعد مدرسہ کی

فلاح و بہبود کے لئے سرگرم عمل ہوگئے۔ فضل خداوندی سے بلریا گنج کے ایک دوسرے عالم و فاضل محترم مولوی محمد عیسیٰ صاحب نے بھی احیاء العلوم مبارک پور سے تکمیل تعلیم کے بعد مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔

۱۹۵۹ء تک درجہ پنجم کا آغاز ہو چکا تھا اور کچھ عربی و مذہبی تعلیم بھی داخل نصاب تھی۔ ساتھ ہی مدرسہ کا نام بدل کر "جامعہ اسلامیہ" کر دیا گیا۔

ثانوی درجات کے اضافے اور جامعہ اسلامیہ کو بحیثیت ایک اصلاحی، مذہبی و دینی ادارہ کی شکل میں منظر عام پر لانے کی تحریک کے آغاز سے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد اکرام خاں کے مطابق مدرسہ کی توسیع کی تحریک محترم مولوی محمد عیسیٰ صاحب کی آغاز کردہ ہے جیسا کہ ان کا کہنا ہے:

" مئی ۱۹۵۹ء تک جامعہ میں درجہ اول سے پنجم تک ہی تعلیم کا نظم تھا۔ اسی دوران عیسیٰ صاحب فراغت کے بعد یہاں آئے۔ عام اجلاس میں انھوں نے عظیم دینی و تعلیمی ادارہ کا ایک ماہرانہ منصوبہ پیش کیا۔ اس تجویز کو پسند تو سب نے کیا لیکن محدود ذرائع و قلت آمدنی کی وجہ سے کوئی اقدام نہیں کر سکا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے اس کو قبول کر لیا اور یہ بات پورے قصبہ میں پھیل گئی۔ لوگ الگ الگ صحبتوں میں اس پر بحث و گفتگو کرنے لگے۔ مولوی عیسیٰ صاحب مسلسل تین بار عام اجلاس میں اپنی تجویز پیش کی یہاں تک کہ تیسرے اجلاس میں انھوں نے برملا کہا کہ ایک جھونپڑی بنا دیجئے اور مجھے اس میں دینی ادارہ قائم کرنے دیجئے درجہ پنجم کے بعد میں خود ہی مالیات و اساتذہ کی فراہمی کا ذمہ دار رہوں گا۔ ان کے اصرار پر عوام نے انھیں مدرسہ میں ایک نیا درجہ کھولنے کی اجازت دے دی۔"

بہر حال ماسٹر عبد الجلیل صاحب کے دعویٰ کے مطابق مدرسہ کی تحریک توسیع محترم ڈاکٹر خلیل صاحب کے مرہون منت ہے۔ یہ تحریک اس وقت وجود میں آئی جب ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے تکمیل تعلیم کے بعد وطن واپس آئے تھے۔ وطن واپسی کے بعد آپ نے تحریک توسیع کی سرگرمیوں میں بڑی ہی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ وہ انفرادی طور سے پورے علاقے کے تمام ہی دانشوروں سے بلریا گنج میں دینی و جدید دونوں قسم کی تعلیم کی ترویج و ترقی جیسے مسائل پر بحث و گفتگو کیا کرتے اور فیصلے لیتے۔ وہ ایک ایسے ادارہ کے قیام کے بارے میں فکر مند رہا کرتے تھے جو دینی و جدید تعلیم کا ایک حسین امتزاج

ہو۔ منظم ہو۔

جب کہ مفتی عبدالرؤف صاحب کے مطابق جب ۱۹۵۷ء میں بحیثیت استاذ ان کا تقرر ہوا تو مدرسہ بس ایک مکتب کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ جہاں ابتدائی درجات کی تعلیم کا نظم تھا۔ اسے مکتب اسلامیہ، مدرسہ اسلامیہ، جامعہ اسلامیہ کے مختلف ناموں سے جانا جاتا تھا۔ مفتی صاحب کے مطابق قصبہ بلریا گنج کے دانشوروں و ذمہ داروں نے مدرسہ کی توسیع کرنے کا فیصلہ لیا۔ مفتی صاحب نے سمجھا کہ مدرسہ کے نصاب میں انگریزی اور جدید مضامین کو داخل کیا جائے گا اور علم جدید کی اشاعت کے لئے اسے کالج ٹائپ ادارہ بنایا جائے گا۔ لیکن مفتی صاحب کو بعد میں معلوم ہوا کہ ذمہ داران مدرسہ کو ملک بھر میں اسلامی تعلیم کا ایک ایسے عظیم الشان قلعہ کی شکل دینا چاہتے تھے جو علوم جدیدہ کے پہلو بہ پہلو دینیات کی بھی تعلیم کا گہوارہ ہو۔ عمومی لحاظ سے قصبہ بلریا گنج کے تمام ہی باشندگان اور خاص طور سے کچھ شرفاء نے اس مقصد کے تحت کوشش شروع کی لیکن ڈاکٹر خلیل صاحب اس تحریک کے روح رواں تھے۔

جامعۃ الفلاح کے تاسیسی ممبران میں سے ایک حاجی امانت اللہ صاحب ادارہ کے خاکہ کی مسودہ کاری و تحریک توسیع کے دونوں مواقع یعنی ۱۹۵۶ء و ۱۹۵۹ء حکیم محمد ایوب صاحب سے منسوب کرتے ہیں جبکہ ماسٹر جنید صاحب ایک دینی درسگاہ کی تجویز و اس کی خاکہ کشی کو حاجی محمد اکرام پردھان سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مرور زمانہ کے ساتھ اپنے ترتیباتی مقاصد کے حصول سے بہرور ہوتے ہوئے جامعہ جب ۱۹۵۹ء میں داخل ہوئی تو اعلان کیا گیا کہ مدرسہ کو جامعہ بنانا ہے جس کے توسط سے اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن ہو سکے۔ اس وقت کے ناظم حاجی عبدالمجید صاحب نے انتظامیہ کی ذمہ داری حاجی محمد اکرام پردھان کے سپرد ان الفاظ کے ساتھ کی "میں اب ایام پیری سے گزر رہا ہوں اور یہ کام روز بروز بڑھ رہا ہے لہٰذا اس کام کو کسی نوجوان، بہادر اور متحرک شخص کے حوالے کر دینا چاہئے۔ حاجی محمد اکرام پردھان ہی نے مدرسہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دیا تھا۔ جامعہ کے اکاؤنٹ میں انھیں صرف ۱۵ پیسے ملے تھے۔ جبکہ اسٹاف میں موجود اساتذہ کی ماہانہ تنخواہ ۱۲۶ روپیہ تھی۔"

بہر حال مولوی محمد عیسیٰ صاحب کا اصرار ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۹ء کے عام اجلاسوں میں متعدد بار مقامی حضرات کے سامنے ایک دینی ادارہ کی حیثیت سے مدرسہ کو ترقی دینے کے مسئلے کی گزارش

کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ قصبہ بلریا گنج کو اطراف میں چونکہ مرکزیت حاصل ہے اس لئے یہاں ایک دینی ادارہ کا قیام عمل میں آنا چاہئے تاکہ وہ تعمیر و حفاظت اپنی منزل طے کر سکے۔ تمام ہی عوامی نمائندگان و شرکاء اجلاس نے ان کے مشورہ کو قبول کیا اور اس طرح سے جولائی ۱۹۵۹ء میں مدرسہ میں درجہ ششم کا اضافہ ہوا۔

درجہ ششم کے آغاز سے مدرسہ کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جامعہ کے موسسین کے سامنے دو مختلف تعلیمی نمونے زیر غور تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ مدرسہ خالص دینی ہو اور جہاں بقدر ضرورت جدید مضامین کی بھی تعلیم کا نظم ہو۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ ادارہ جدید کالج کی طرح کا ہو جہاں دینیات کی تعلیم بھی فراہم کی جائے۔ لمبی بحث و گفتگو اور غور و خوض کے بعد پہلی رائے کو ہی موزوں سمجھا گیا اور اسے شرف قبولیت عطاء ہوئی۔

مولوی محمد عیسیٰ صاحب کو استاذ مقرر کیا گیا۔ انھوں نے جامعہ کے نصاب میں عربی زبان کی کچھ بنیادی کتابیں داخل کیں۔ لیکن وہ یہ کام منظم انداز میں نہیں کر سکے۔ جولائی ۱۹۵۹ء کے اسی مہینے میں مولوی رحمت اللہ، شیخ ادریس اور محترم جنید احمد صاحب کا بھی تقرر عمل میں آیا۔ مولوی محمد عیسیٰ و مولوی رحمت اللہ صاحب عربی و دینیات پڑھاتے تھے جبکہ ماسٹر جنید صاحب انگریزی و ہندی کے استاذ تھے۔

۱۹۵۹ء تک ثانوی درجات کی ابتداء سے عربی، اردو، انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، عام معلومات، جلد سازی اور باغبانی وغیرہ جیسے متعدد مضامین جامعہ کے نصاب تعلیم میں داخل کیے گئے اور بحسن و خوبی ان کی تعلیم و تدریس ہوتی رہی۔ نصاب میں داخل کتابیں جماعت اسلامی ہند کی تیار کردہ تھیں لیکن اس کا الحاق ضلع تعلیمی بورڈ سے بھی رہا۔ اس لئے مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

دینی تعلیمی کونسل سے الحاق :

۶ نومبر ۱۹۶۰ء بروز اتوار جامعہ اسلامیہ بلریا گنج میں دینی تعلیمی کونسل کی ایک عام میٹنگ منعقد کی گئی۔ انجمن تعلیمات دین کی مقامی کمیٹی کی تشکیل قصبہ بلریا گنج میں ہوئی اور ڈاکٹر خلیل صاحب کو اس کا سکریٹری یا صدر منتخب کیا گیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۶۰ء کو جامعہ اسلامیہ کا انجمن تعلیمات دین (دینی تعلیمی

کونسل) سے الحاق ہوا۔ انجمن کی کوششوں سے ملریا گنج کے ارد گرد بہت سے دوسرے مکاتب بھی قائم ہوئے ان کی تنظیم میں جامعہ اسلامیہ نے بڑا اہم رول ادا کیا۔

جامعہ کی ترقی کا نمایاں دور :

۱۹۵۹ء سے لیکر ۱۹۶۱ء تک کے تین سال جامعہ اسلامیہ کی سرگرمیوں میں اپنے تدریجی ارتقاء کی بنیاد پر بڑے اہم و نمایاں ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ جامعہ دینیات و عربی کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا۔ ابتداء میں عربی زبان کے کچھ غیر مستقل کورسز داخل نصاب تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کی جگہ منظم نصاب نے لے لی۔ مزید برآں یہ دور بہت ساری تبدیلیوں کی وجہ سے بھی نمایاں ہے۔ جیسے کہ ۱۹۶۰ء میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ ضلع تعلیمی بورڈ سے جامعہ کا الحاق منسوخ کرایا جائے اور اس فیصلہ کو ۱۹۶۱ء میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس فیصلہ کے لازمی نتیجے کے طور پر مئی ۱۹۶۱ء میں ضلع تعلیمی بورڈ کے ماتحت جامعہ کا آخری Batch (گروپ) امتحان میں شریک ہوا۔ یہ قدم ادارہ کی خودمختاری کو قائم رکھنے کے لئے اٹھایا گیا تھا۔

مؤسسین جامعہ نے بالکل آغاز ہی سے یہ منصوبہ بنا لیا تھا کہ جامعہ خودمختار ہوگا۔ وہ اپنی مرتب کردہ پالیسی پر عمل پیرا ہوگا۔ حکومت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ سے منسوخی کے قدم سے قصبہ کے لوگوں کو اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ انھیں لگا کہ اب ان کے بچوں کا داخلہ جونیئر بیسک ہائی اسکول میں نہیں ہوسکے گا۔ ۵ رمئی ۱۹۶۱ء کو قصبہ کی دونوں مسجدوں میں لوگوں کو عام اجلاس کی دعوت دی گئی اور نماز جمعہ کے بعد قدیم مسجد میں عام اجلاس منعقد ہوا۔ سب سے پہلی اور بنیادی چیز جو اس میٹنگ میں زیر بحث آئی وہ نیا نصاب تھا۔ لوگوں نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا کہ اب تو ہمارے بچے ڈسٹرکٹ بورڈ کے امتحان میں شریک نہیں ہو پائیں گے نتیجتاً جونیئر ہائی اسکول میں ان کا داخلہ بھی نہیں ہوسکے گا۔ میٹنگ میں موجود کسی شخص نے انجمن تعلیمات دین کے قاضی عدیل عباسی کا حوالہ بھی دیا۔ اسی میٹنگ میں ۵ رمئی ۱۹۶۱ء کو پہلی مجلس عاملہ کی تشکیل بھی ہوئی۔ مجلس عاملہ نے اپنی پہلی میٹنگ ۱۵ رمئی ۱۹۶۱ء کو منعقد کی۔ حاجی عبد القدوس صاحب کو صدر، محمد اکرام پردھان کو منیجر اور ڈاکٹر خلیل صاحب کو خازن مقرر کیا گیا۔ تعلیمی کمیٹی کے لئے ڈاکٹر وکیل احمد، ڈاکٹر خلیل احمد اور حاجی متین

صاحب کو نامزد کیا گیا۔

۳ رجولائی ۱۹۶۱ء کو ملریا گنج کی مغربی مسجد میں منعقدہ میٹنگ کے اندر تعلیمی کمیٹی نے درج ذیل تین قراردادیں پاس کیں:

☆ ادارہ (جامعہ اسلامیہ) آزاد و خودمختار رہے گا اور اسلامی دائرے میں رہ کر اپنی پالیسی خود ہی بنائے گا۔

☆ اس کے نصاب میں صرف وہی کتابیں شامل کی جائیں گی جو طلبہ کو اسلام سے روشناس کرائیں۔

☆ مخلوط تعلیم صرف دس سال کے بچوں تک کے لئے ہوگی۔ دس سال کی عمر کے بعد بچیوں کے لئے تعلیم کا الگ نظم ہوگا۔

اس دور کے دفتری ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤسسین کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا اور انھوں نے اس کے حصول کے لئے خود کو تیار کر رکھا تھا۔ شروع ہی سے ان کے پاس ایک واضح لائحہ عمل و منصوبہ تھا اور وہ اسے بروئے کار لانے کے لئے پوری کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب جو مؤسسین میں سے ہیں تو ان دنوں علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ جامعہ اپنی طرز کا ایک بالکل منفرد و یکتا ادارہ ہوگا۔ یہ دور انتہائی سرگرمی و جدوجہد کا تھا۔ ٹھیک اسی دور میں تعمیری کام بھی شروع ہوئے تھے۔ طلبہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور قصبہ کے زیرک و دانشور و اعلیٰ خیالات کے حامل حضرات جامعہ کی ترقی کے لئے بےلوث و دائمی خدمات انجام دے رہے تھے۔

آغاز تعمیر:

ابھی تک جامعہ کا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں تھا لہذا مالی ضروریات عوامی تعاون، چندے اور عطیات سے پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھی۔ بڑھتی ضرورت کے پیش نظر ممبران جامعہ کو پہلے سے کہیں بڑی عمارت کی تعمیر کی ضرورت کا احساس ہوا۔ لہذا اس وقت کے ناظم محمد اکرام پردھان نے قصبہ کی مغربی مسجد میں ایک خاص میٹنگ منعقد کی۔ یہ میٹنگ ۳ رجولائی ۱۹۶۱ء کو بلائی گئی۔ مندرجہ ذیل اہم فیصلے اس میٹنگ میں لئے گئے:

☆ پرانی کھپریل کی عمارت کو گرانا اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کرنا۔

☆ خصوصی تعاون کے لئے قصبہ کی دونوں مسجدوں میں درخواست کرنا۔

☆ فنڈ کی فراہمی کے پیش نظر اطراف کی مسلم بستیوں میں نمائندوں کی مختلف جماعتوں کو بھیجنا۔

اس میٹنگ میں یہ بھی فیصلہ لیا گیا تھا کہ ناظم مالیات کے حصول کے مدنظر سنگاپور کا سفر کریں گے۔ نتیجۃً ۶۲-۱۹۶۱ء میں اس عمارت کی بنیاد پڑی جس کو آج مولانا مودودی ہاسٹل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جامعہ اسلامیہ کی پہلی تعمیر سے متعلق ماسٹر جنید صاحب کا کہنا ہے:

"جامعہ ناظم صاحب اور ان کے معاون سکریٹری ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بشرکاء، اساتذہ و طلبہ کی جانفشانی و جدوجہد سے مسلسل ترقی کے راستے پر گامزن تھا۔ جس وقت جامعہ کا آمد و رفت کا توازن ۳ اروپیہ تک پہنچا تو ۲ بڑے، ۲ چھوٹے کمرے و ایک ہال پر مشتمل ایک بڑی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہی عمارت آج مودودی ہاسٹل کے نام سے موسوم ہے۔ خود پردھان مزدوروں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ بیلچہ چلانا اور سر پر مٹی ڈھونا ان کا معمول تھا۔ بسا اوقات وہ اور خلیل صاحب (سکریٹری) لوہے کی تھالیوں کے بنڈل (سک) کو ساتھ ساتھ ڈھوتے۔ غربت و قلت اسباب کے باوجود ایسی عمارت تعمیر ہوئی کہ وہ جامعہ کے لئے انتہائی موزوں و مناسب تھی۔

متعدد تعمیری کاموں اور جامعہ کو بحسن وخوبی چلانے کے لئے مطلوبہ مالیات کی فراہمی کے پیش نظر حاجی اکرام پردھان نے سب سے پہلے بھٹی و سنگاپور جیسے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا شروع کیا۔

جامعۃ الفلاح: جامعہ کی تاریخ میں ۶۲-۱۹۶۱ء کا سال ایک نئے دور کے آغاز کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ ۱۹۶۱ء تک جامعہ میں درجہ ہفتم تک کی تعلیم کا نظم تھا۔ لیکن بہی خواہان جامعہ اس میں ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ خوش قسمتی کہئے یا بدبختی مارچ ۱۹۶۱ء میں جامعۃ الاصلاح سے کچھ اساتذہ و فضلاء کو جماعت اسلامی ہند کا ممبر ہونے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ اس ناخوشگوار واقعہ کا سبب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب کے مطابق یہ تھا کہ مذکورہ علماء مولانا فراہی کے خیالات و نظریات سے کہیں زیادہ جماعت اسلامی ہند کے افکار و آراء سے متاثر تھے۔

ان اخراج شدہ علماء میں سے مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب اپنے آبائی وطن علاؤالدین پٹی اپریل ۱۹۶۱ء میں پہنچے۔ ذمہ داران جامعہ کی سفارش پر آپ ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں جامعہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت کے تمام ہی ذمہ دار جماعت اسلامی ہند سے کسی نہ کسی طرح جڑے ہوئے تھے۔ مولانا اصلاحی نے اصلاحی طرز تعلیم پر تعلیم دینی شروع کر دی۔

مدرسۃ الاصلاح سے علماء کے اخراج سے ضلع اعظم گڑھ کی تحریک اسلامی کے ممبران و متبعین کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے جماعت اسلامی ہند ضلع اعظم گڑھ کے ممبران کو ایک ایسے ادارہ کے قیام کی ضرورت کا احساس ہوا جہاں تحریک اسلامی و اسلام کے بقاء کے لئے نوجوانوں کی کھیپ تیار کی جا سکے۔ ۱۸ تا ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء میں دہلی میں منعقدہ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کی میٹنگ کے سامنے ضلع اعظم گڑھ میں اس طرح کے ادارہ کے قیام کا مشورہ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی نے پیش کیا۔ آٹھ مہینے بعد ۱۴ تا ۱۸ دسمبر ۱۹۶۱ء کے اپنے اجلاس میں جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس طرح کے مدرسہ کے قیام کا فیصلہ لیا۔

اپریل ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں ایک عربی دارالعلوم کے قیام سے متعلق ایک تجویز غور و خوض کے لئے پیش ہوئی تھی اور یہ فیصلہ لیا گیا تھا کہ مذکورہ دارالعلوم کی مکمل اسکیم کی جانچ پڑتال مشرقی یوپی کے قیم جماعت اور تجویز دہندہ کریں گے۔ اور پھر اس کی روشنی میں فیصلہ لیا جائے گا۔

مذکورہ تجویز اس وقت کونسل کے سامنے ہے۔ اور یہ فیصلہ ہوا ہے کہ جماعت اسلامی ہند اعظم گڑھ میں جامعۃ الرشاد کے قیام کی اجازت نہیں دے گی۔ اگر کچھ لوگوں کو اپنی مرضی سے ادارہ کے قیام کے خواہاں ہیں تو انہیں مرکز سے منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ جماعت اسلامی ہند ضلع اعظم گڑھ کے درج ذیل ممبران مولانا ملک حبیب اللہ قیم جماعت اسلامی مشرقی یوپی، مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب ناظم علاقہ اور مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب نے ضلعی میٹنگ میں اعظم گڑھ کے اندر عربی ادبی مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۳ شوال ۱۳۸۱ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۹۶۲ء سے ان حضرات کی کوششوں کے طفیل اعظم گڑھ میں جامعۃ الرشاد نے کام شروع کر دیا۔ مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب اس کے پہلے ناظم تھے۔

مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے جامعۃ الرشاد کے لئے وسط ۱۹۶۲ء میں رخت سفر باندھا۔ مولانا کی جدائی سے وابستگان جامعہ کو ایک بار پھر ایک ایسے قابل استاذ کی ضرورت محسوس ہوئی جو مولانا کے رائج کردہ کورسز کو تسلسل و دوام عطا کر سکے۔ لہذا مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب کی خدمات مولانا کے خلا کو پر کرنے کے لئے حاصل کی گئی۔ ملک حبیب اللہ و مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب کے مشورہ سے وسط ۱۹۶۲ء میں مولانا شبیر صاحب جامعہ تشریف لائے۔ مولانا جامعہ میں اپنے تقرر کے بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:

"مدرسۃ الاصلاح سے اخراج کے بعد جامعۃ الفلاح میں مولانا عبدالحسیب صاحب بحیثیت استاذ ایک یا دو مہینے ہی رہے۔ ان دنوں ہی اعظم گڑھ میں جماعت اسلامی کے اعلی تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے جامعۃ الرشاد کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مدرسہ کو تحریک اسلامی کے ممبران کا مکمل تعاون حاصل تھا اور مولانا مجیب اللہ صاحب بھی جماعت اسلامی کے ممبر تھے۔ انھیں کے مستقل اصرار پر مولانا عبد الحسیب صاحب جامعۃ الرشاد منتقل ہو گئے۔ اس وقت میں بہار کے پورنیہ ضلع میں ایک مدرسہ کے اندر استاذ تھا۔ خبر ملنے پر میں نوکری کی تلاش میں اعظم گڑھ آیا۔ خوش قسمتی سے جماعت اسلامی کی ضلعی میٹنگ اشرف پور میں منعقد ہونے والی تھی میں نے اس میں شرکت کی۔ جامعۃ الرشاد میں اپنی تقرری کی سفارش پر میرے استاذ مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب ناظم ضلع نے مجھے مشورہ دیا کہ جامعۃ الرشاد کے بجائے بلریا گنج کا مدرسہ میرے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔ پھر انھوں نے حکیم محمد ایوب رحمٰنی صاحبان سے میرا تعارف کرایا اور میں بلریا گنج میں آ گیا۔"

اس طرح سے مولانا شبیر احمد صاحب ۱۹۶۲ء میں جامعہ آئے۔ یہاں پہنچ کر مولانا نے خود کو جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر دیا۔ اور دن و رات کام کرنے لگے۔ عوام، طلبا اور مدرسے کے اساتذہ کو جوش و ولولہ سے سرشار کرنے کے لئے مولانا نے ایک ترانہ بر قرطاس کیا اور اسے قصبہ بلریا گنج کی گلیوں میں گنگنانے لگے۔ مولانا کا وہ خود ساختہ ترانہ درج ذیل ہے:

مطلع انوار رحمت چشمۂ رحمانیہ
مصدر عرفان و حکمت جامعہ اسلامیہ

احمد و ادریس و عیسیٰ حافظ شبیر خان
ان کی آنکھوں کا ہے تارہ جامعہ اسلامیہ

اب انھیں احباب کا خادم ہے یہ شبیر بھی
دیکھنا اب چمک اٹھے گا جامعہ اسلامیہ

اب بلریا گنج کی قسمت کا تارہ چمک گیا
ضوفشاں ہونے کو ہے جامعہ اسلامیہ

دارین کی فلاح کا مرکز بنے گا
صرف چند سالوں میں جامعہ اسلامیہ

بچیاں زہرہ بنیں گی اور بچے حسین
تربیت گاہ نبی ہوگا جامعہ اسلامیہ

مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب نے ۱۹۶۲ء میں مدرسہ اسلامیہ کو بدل کر "جامعہ اسلامیہ" کر دیا تھا۔ جبکہ مولوی عیسیٰ صاحب مولانا فلاحی کی تردید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ۱۹۵۹ء سے ہی جامعہ اسلامیہ لکھا کرتے تھے۔ محمد عارف خاں کے مطابق ادارہ کو "جامعہ اسلامیہ" کا نام ۱۹۵۹ء میں دیا گیا تھا۔ جہاں تک دفتری ریکارڈ کا تعلق ہے تو ان کے مطابق مولانا شبیر احمد صاحب اصلاحی کے آنے سے کافی پہلے مدرسہ اسلامیہ کو جامعہ اسلامیہ کہا جاتا تھا۔ ثبوت کے طور پر مورخہ ۵ رمئی ۱۹۶۱ء تا ۲۹ رمئی ۱۹۶۲ء کی مجلس انتظامیہ کی رپورٹوں پر مبنی سب سے پہلا منظم دفتری رجسٹر پیش کیا جا سکتا ہے جس پر مکتبہ یا مدرسہ اسلامیہ کے بجائے ادارہ کا نام جامعہ اسلامیہ لکھا ہوا ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ خود مولانا بھی رقمطراز ہیں کہ انھوں نے ہی ۱۹۶۲ء میں ادارہ کا نام بدل کر جامعہ اسلامیہ رکھا۔

۱۹۶۲ء تک جامعہ نئے عزم و حوصلے کے ساتھ رواں دواں تھا۔ مولانا شبیر اصلاحی صاحب نے ایک مستقل نصاب تشکیل دیا۔ ان کی محنت رنگ لائی اور ایک انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے علاقے کے لوگ جامعہ کی ترقی میں گہری دلچسپی لینے لگے۔ انتظامیہ نے بغرض حصول استفادہ مولانا کو ۲۵ ردسمبر ۱۹۶۲ء کو جامعہ کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔

۱۷؍دسمبر ۱۹۶۲ء کو مجلس انتظامیہ کے سالانہ اجلاس میں "جامعہ اسلامیہ" سے ادارہ کا نام بدل کر "جامعۃ الفلاح" کر دیا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت محمد اکرام خان پردھان نے کی تھی۔ اس اجلاس میں نئے تعلیمی سیشن کا پلان بھی پیش ہوا تھا اور فیصلہ ہوا تھا کہ ۱۹۶۳ء میں عربی اول کا آغاز ہوگا۔ مزید برآں ایک پختہ کرو یا نئی عمارت کی تعمیر پر بھی اتفاق ہوا تھا۔

نام کی تبدیلی پر ہمیں اختلاف ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے مطابق مولانا عبدالرؤف مبارکپوری صاحب نے جامعۃ الفلاح کا نام پیش کیا جبکہ دوسرے لوگ مولانا شبیر صاحب کی طرف اس کو منسوب کرتے ہیں حالانکہ خود ان حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے ہی جامعہ کا نام بدلا۔ مولانا شبیر صاحب کہتے ہیں:

"سب سے پہلے میں نے مدرسہ کو جامعہ اسلامیہ کا نام دیا اور جون ۱۹۶۲ء تک یہ جامعہ اسی کے نام سے موسوم رہا۔ ۲۰؍جون ۱۹۶۲ء کو مجھے ایک موقع ملا اور مجھے صدر اور ڈاکٹر خلیل صاحب کو ناظم مقرر کیا گیا۔ سوال ہمارے سامنے یہ تھا کہ فارغین جامعہ کس نام سے منسوب ہوں گے۔ میرے سامنے اس سلسلے میں کئی نام آئے لیکن بالآخر میں نے ۱۹۶۳ء میں جامعہ کی سالانہ رپورٹ "جامعۃ الفلاح" کے نام سے شائع کی اور تبھی سے جامعہ اسلامیہ کو جامعۃ الفلاح کہا جانے لگا۔"

مفتی عبدالرؤف صاحب مبارکپوری کو قول مذکور سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کا کارنامہ ہے:

"ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے مجھ سے ایک بار اس ادارہ کے لئے نام تجویز کرنے کو کہا جس سے طلبہ منسوب کئے جاسکیں۔ میں نے انھیں دو نام دیئے: جامعۃ الفلاح اور فلاح دارین۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا دونوں نام طویل ہیں۔ میں نے کہا دونوں صورتوں میں فارغین اپنے نام کے بعد فلاحی لکھ سکتے ہیں۔ اس طرح مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں جامعۃ الفلاح کا نام شرف قبولیت سے نوازا گیا۔"

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ادارہ کے نام سے متعلق دونوں بیانات کے مخالف ہم نوا بھی ہیں۔ محترم عبدالجلیل و مولوی محمد عیسیٰ صاحب پورے وثوق سے مولانا مبارکپوری کی تائید کرتے ہیں جیسا کہ مولوی عیسیٰ صاحب کا کہنا ہے کہ:

"جہاں تک مجھے یاد ہے نام ۱۹۶۲ء میں تبدیل ہوا جب ممبران نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مدرسہ ایک گہوارہ علم کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا۔ اور مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش کردہ ناموں میں سے ایک نام "جامعۃ الفلاح" کا تھا۔ کچھ لوگ اس نام کو مولانا ابوبکر اصلاحی سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن میرے علم کے مطابق یہ نام مولانا مبارکپوری کا تجویز کردہ تھا۔"

محمد عارف خاں کے مطابق یہ نام مولانا شبیر احمد اصلاحی نے تجویز کیا تھا:

"چونکہ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا لہذا اس ادارہ کی انفرادیت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا شبیر احمد صاحب اصلاحی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ادارہ کا نام ایسا ہو جس سے فارغین جامعہ خود کو منسوب کرسکیں اور ان کی تشخیص ممکن ہو سکے۔ ۱۷؍دسمبر ۱۹۶۲ء کو مولانا کے مشورہ پر ممبران نے اتفاق کرلیا اور مدرسہ کا نام "جامعۃ الفلاح" رکھا گیا۔"

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب جو موسسین جامعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ مسئلہ زیر بحث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"۱۹۶۲ء میں میٹنگ کے اندر یہ سوال اٹھا کہ ادارہ کا کوئی ایسا نام ہونا چاہئے جس سے فارغین خود کو منسوب کرسکیں۔ مجھے یاد نہیں کہ موجودہ نام کی تجویز کس نے پیش کی تھی۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم اس وقت قصبہ کی مغربی مسجد میں اسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے "قد افلح المومنون" قرآن کی آیت تلاوت فرمائی اور "فلاح" نام کی تجویز پیش کی۔"

اس سلسلے میں مولانا ابوبکر اصلاحی کا بیان درج ذیل ہے:

"ہم یعنی ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، مولانا حبیب اللہ صاحب اور میں بازار والی مسجد میں تھے۔ عصر کی نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ جس وقت صحن سے گزر رہے تھے میں نے "قد افلح المومنون" آیت تلاوت فرمائی اور کہا کہ مدرسہ کا نام "جامعۃ الفلاح" ہونا چاہئے۔ مولانا حبیب اللہ صاحب نے میری تائید کی اور اس طرح سے ادارہ کا نام "جامعۃ الفلاح" پڑا۔"

عربی درجات کا آغاز:

جامعۃ الفلاح میں عربی درجات کے آغاز کا مسئلہ ممبران کی سالانہ میٹنگ منعقدہ ۱۷؍دسمبر

۱۹۶۲ء کو زیر بحث آیا تھا۔ تجویز منظور بھی ہوگئی تھی۔ اور فیصلہ ہو گیا کہ پکا کر دیا گئی عمارت اس مقصد کے لئے تعمیر کی جائے گی۔ اس کے ممبران نے عطایا کی درخواست کی اور تعمیرات کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں مخصوص نمائندے بھیجے گئے۔ اس طرح ۱۹۶۳ء میں عربی اول کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۳ء کے طلبہ پاس ہو کر ۱۹۶۴ء میں عربی دوم میں داخل ہوئے۔ اور اس طرح عربی دوم کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۴ء ہی میں اصلاح سے خارج اساتذہ و ماہرین اپنے طلبہ کے ساتھ جامعۃ الفلاح پہنچے اور فوراً عربی سوم و چہارم کی ابتدا ہوئی۔

فضیلت کے درجات ۱۹۶۵ء و ۱۹۶۶ء میں قائم ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں فارغین کا پہلا گروپ تکمیل تعلیم کے بعد جامعہ سے نکلا۔ مولانا شبیر احمد صاحب عالمیت و فضیلت کے آغاز سے متعلق فرماتے ہیں:

"میں نے مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب و اپنے استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندوی کو خط لکھا کہ بلریا گنج کا مدرسہ "جامعہ اسلامیہ" بن گیا ہے اور اسے آپ کی خدمات مطلوب ہیں۔ میں پوربیہ بہار سے کچھ طلبہ کو اپنے ساتھ لایا۔ اور عربی سوم کا آغاز کیا۔ جب مولانا عبدالحسیب صاحب جامعۃ الرشاد سے کچھ طلبہ کے ساتھ جامعہ تشریف لائے تو ہم نے عربی چہارم شروع کیا۔ مزید برآں مولانا جلیل احسن ندوی بھی اپنے طلبہ کے ساتھ آئے اور فضیلت کا آغاز ہوا۔"

جامعۃ الفلاح کے اغراض و مقاصد "اسلامی مکتبہ" کے قیام کا بنیادی اور اہم مقصد بچوں کو عقائد اسلام کا بنیادی تصور و علم فراہم کرنا تھا تاکہ وہ دنیوی تعلیم کی تحصیل سے پہلے قرآن کی قرأت و تلاوت کر سکیں۔ جامعہ کا مقصد ایسے افراد کی تیاری رہا ہے جو:

[الف] قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

[ب] جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار و نظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

[ج] جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔ وغیرہ

۳ رجولائی ۱۹۶۱ء کو قصبہ کی مغربی مسجد میں منعقد مجلس تعلیمی نے تعلیم کی ترقی کے حوالے سے

فیصلہ کیا کہ جامعہ کے نصاب میں صرف وہی کتابیں شامل کی جائیں گی جو اسلام کو سمجھنے میں طلبہ کی معاون ہوں۔

۲۹ رجون ۱۹۶۲ء کو جامعۃ الفلاح کی مجلس انتظامیہ کے ذریعہ سے منظور آئین کے مطابق جامعہ کے درج ذیل اغراض و مقاصد ہیں:

(۱) [الف] ایسے افراد کی تیاری جو قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

[ب] جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار و نظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

[ج] جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔

[د] جن میں احیائے دین و اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ ہو۔

[ہ] جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۲) ایسا نصاب تعلیم زیر عمل لانا جس میں دینی و عصری علوم کا بہترین امتزاج ہو اور جو جامعہ کی اساس سے ہم آہنگ ہو۔

(۳) اسلام کی خدمت کے لئے دور جدید کے تقاضوں کے مطابق فکری، علمی و تحقیقی مواد فراہم کرنا۔

(۴) فنی، تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا اس طرح نظم کرنا کہ جامعہ کا بنیادی مقصد متاثر نہ ہو۔

کلیۃ البنات :

مسلم بچیوں کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ کیونکہ مسلمانوں نے جدید لادینی اداروں کو تہذیب و عقیدہ کا مذبح خانہ سمجھ کر بچیوں کو جاہل ہی رکھنا زیادہ بہتر گردانتے رہے ہیں۔ جامعۃ الفلاح نے اس خلا کو پر کیا اور تعلیم نسواں کا علم بلند کیا۔ جامعہ میں تعلیم نسواں کا نظم بالکل ابتدا ہی سے موجود تھا۔ لیکن ان کی تعلیم صرف درجہ چہارم تک ہوتی تھی۔ ۲۸ رمئی ۱۹۶۱ء کو انتظامیہ کی میٹنگ میں تعلیم نسواں کے لئے علاحدہ اعلیٰ تعلیم گاہ کی تجویز پیش کی گئی۔ بعد ازاں ۲۱ رنومبر ۱۹۶۵ء کو انتظامیہ کے اجلاس میں کلیۃ

البنات کی تجویز منظور کر لی گئی اور اسی سال گرلس کالج کے لئے قصبہ کے مغربی مسجد کے پاس ایک عمارت خریدی گئی۔

درجہ پنجم کے آغاز سے گرلس کالج نے ۱۹۶۶ء سے فریضۂ منصبی ادا کرنا شروع کر دیا۔ جونپور سے ایک معلمہ کو لایا گیا جو مذکورہ عمارت میں سکونت پذیر تھیں۔ ان کی آمد کے دوسرے دن پانچ سے سات بچیوں کا درجہ پنجم میں داخلہ ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں درجہ سوم سے درجہ ہفتم کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ درجہ اطفال سے درجہ سوم تک مخلوط تعلیم کا نظم تھا۔ بچیوں کا نصاب بچوں سے ذرا مختلف تھا۔ کچھ مخصوص مضامین مثلاً تکنیکی، پیشہ ورانہ، گھریلو سائنس اور ٹیلرنگ وغیرہ کا ان کے نصاب میں اضافہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ چار سے پانچ بسوا زمین خریدی گئی اور ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران ایک عمارت کی تعمیر ہوئی۔ ذمہ داروں کی کوششوں سے عالمہ اول ۱۹۷۸ء، عالمہ دوم ۱۹۷۹ء، عالمہ سوم ۱۹۸۰ء، عالمہ چہارم ۱۹۸۱ء، فاضلہ اولیٰ ۱۹۸۲ء و فاضلہ اخری ۱۹۸۳ء میں شروع ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں فاضلات کا پہلا گروپ فارغ ہوا اور انھیں سند فضیلت عطا کی گئی۔ فی الحال طالبات کا اپنا ایک علیحدہ و مکمل فضیلت تک کا نصاب ہے۔ یہ نصاب ۱۲ سالہ ہے۔

دار الاقامہ :

۱۹۶۲ء میں مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب کی کچھ طلبہ کے ساتھ جامعہ تشریف آوری سے فلاح میں دار الاقامہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان بیرونی طلبہ کے علاوہ کچھ مقامی طلبہ بھی ہاسٹل میں رہا کرتے تھے۔ مقامی طلبہ کو بہر حال مطبخ سے استفادہ کی اجازت نہیں تھی۔ موجودہ مودودی ہاسٹل جو ایک ہال، چار کمروں اور دو سائڈ روم پر مشتمل ہے اور جس کی تعمیر ۶۲-۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی، درجہ اور ہاسٹل دونوں کے لئے مستعمل تھا۔ شروع میں بیرونی طلبہ کے لئے کھانے کا بندوبست قصبہ بلریا گنج کے اصحاب خیر کیا کرتے تھے۔

۱۷/دسمبر ۱۹۶۲ء کے اپنے سالانہ اجلاس میں انتظامیہ نے اگلے تعلیمی سال کے لئے ایک باقاعدہ مطبخ کے قیام کی منظوری دی۔ فی الحال ایک باورچی کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۶۳ء میں جب عالیت کا آغاز ہوا تھا، مطبخ نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں اینٹ و کھپریل کی پہلی عمارت مطبخ کے

لئے تعمیر کی گئی۔ اس کی بنیاد ۱۹۶۴ء میں ڈالی گئی تھی۔

تعمیری کام:

جامعۃ الفلاح کے لئے تعمیری کاموں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور اس کے متعدد شعبوں کو تقویت ملتی رہی مثلاً ۱۹۶۳ء میں درجات کے لئے ایک بڑی عمارت تعمیر کی گئی۔ مسجد کا سنگ بنیاد ۱۹۶۹ء میں رکھا گیا اور کام شروع ہو گیا۔ حسن البنا منزل اور مودودی ہاسٹل کی بالائی منزلیں ۱۹۶۹ء و ۱۹۷۰ء میں تعمیر ہوئیں۔ ان کے بعد حبیبہ منزل کی تعمیر ہوئی۔ نیا گرلس کالج موسوم 'دار التعلیم' جو بائیس کمروں اور دو ہالوں پر مشتمل ایک وسیع عمارت ہے، کی تعمیر ۹۱-۱۹۹۰ء میں ہوئی۔ گرلس ہاسٹل "صفیہ منزل" جو پانچ سو طالبات کی رہائش کے لئے کافی ہے، کی تعمیر ۱۹۹۲ء میں ہوئی۔

جامعۃ الفلاح کا صدر دروازہ اور ابو اللیث ہال کی تعمیر ۱۹۹۰ء و ۱۹۹۳ء میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں مرکزی لائبریری کی شاندار عمارت اور جامعہ کے طلبہ کے لئے ہاسٹل ۱۹۹۸ء میں بنا۔ ۱۹۸۷ء میں مطبخ میں ایک عمارت کا اضافہ کیا گیا اور ۱۹۹۷ء میں کچھ درجات کا اضافہ تعمیر ہوئی۔ مسجد کی توسیع بھی ۱۹۹۸ء میں ہوئی۔

جامعۃ الفلاح پر موجود مواد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی عمارت خواہ بڑی ہو یا چھوٹی تعمیر کرنی ہوتی تھی یا کوئی زمین خریدنی ہوتی تھی تو امیر و غریب بھی سے یکساں طور پر امداد طلب کی جاتی تھی۔ عطایا و ہدایا کے لئے درخواست کی جاتی تھی۔ ان کوششوں کے علاوہ ۱۹۵۶ء سے جامعۃ الفلاح کے اہم ترین معمار و روح حکیم ایوب صاحب تھے۔ حکیم صاحب مقامی خیر خواہ اور جامعہ کے چوٹی کے موسسین میں سے تھے۔ منشی کمال صاحب جنھوں نے ۱۹۶۳ء میں جامعہ کو گلے لگایا، کے مطابق جامعہ کو مالیات کے میدان میں ترقی میں حکیم صاحب کا سب سے اہم رول رہا ہے۔ وہ ریڑھ کی ہڈی تھے۔ اولین فارغین جامعہ میں سے ایک ملک حبیب احمد صاحب جمالی فلاحی کے مطابق:

"حکیم جی نے جامعہ کی ترقی میں وہ رول ادا کیا جو پیغمبر اسلام کی قائم کردہ ریاست کو تقویت پہنچانے میں تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے ادا کیا تھا۔"

جامعہ کا کوئی باقاعدہ مخصوص ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ لہذا امدادیات کی فراہمی کے لئے مقامی

ذرائع کے علاوہ غیر مقامی حضرات وقدیم طلبہ جامعہ جو مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، سے تعاون لیا جاتا رہا ہے۔ یہ مالی ضروریات عشر، زکوٰۃ، صدقہ، ہدیہ، عطیہ، خیرات، صدقۂ فطر، چرم قربانی ونقدی وغیرہ سے پوری کی جاتی ہیں۔ حکومت کی دخل اندازی اور اس کے دباؤ سے تحفظ کے پیش نظر جامعہ نے اپنی خودمختاری کا کسی بھی طرح کے سرکاری تعاون سے سودا نہیں کیا۔ اپنی مالیات کے لئے جامعۃ الفلاح کلی طور پر مسلم معاشرہ کے عطیات کا مرہون منت رہا ہے۔ یہ عطیہ چاہے بصورت نقد ہو یا جنس۔

تنظیمی ڈھانچہ:

جامعۃ الفلاح کے انتظامی وتنظیمی ڈھانچہ کے لئے جو ابد واب تک درج ذیل متعدد اعلیٰ تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں:

[۱] مجلس شوریٰ [۲] مجلس عاملہ [۳] مجلس تعلیمی [۴] مجلس امتحانات [۵] مجلس معائنہ

[۱] مجلس شوریٰ:

مجلس شوریٰ سب اعلیٰ وطاقتور تنظیمی وپالیسی ساز کمیٹی ہے۔ اس میں تین بنیادی اور دس سے پندرہ تک عام ممبران ہوتے ہیں۔ عام ممبران کا انتخاب متفقہ طور پر یا مجلس شوریٰ کی کثرت رائے سے تین سالوں کے لئے ہوتا ہے۔ ہر وہ اعلیٰ افسر جو مقاصد جامعہ سے پوری طرح متفق ہو۔ جامعہ کی ترقی کا مشتاق ہو اور عملی تعاون کے لئے راضی ہو۔ وہ شوریٰ کا ممبر چنا جا سکتا ہے۔ شوریٰ سال میں کم از کم دو بار منعقد ہوگی۔ ناظم، نائب ناظم، معتمد مال، مہتمم تعلیم وتربیت شوریٰ کے سابق ممبران ہوا کرتے ہیں۔ شوریٰ وہ سپریم کمیٹی ہے جو پالیسی بناتی ہے اور ادارہ کے انتظامی وتعلیمی معاملات کو کنٹرول کرتی ہے۔ انتظامی وتعلیمی امور سے متعلق شوریٰ کے فیصلے اہلکاروں پر سرکاری حکم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مجلس عاملہ، مجلس تعلیمی، مجلس معائنہ، مجلس امتحانات اور تمام دیگر اہلکاروں کی سرگرمیوں کی نگرانی بھی کرتی ہے۔ مختلف مقاصد کے پیش نظر شوریٰ ذیلی کمیٹیاں بھی تشکیل دیتی ہے۔

مجلس عاملہ شوریٰ کی ماتحتی میں اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ اس کمیٹی کے ممبران شوریٰ کے فیصلے کے نفاذ پر معمور ہوتے ہیں۔ یہ شوریٰ کے فیصلوں کے نفاذ، ناظم کا تعاون اور روزمرہ کے اصول و انتظام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ناظم، نائب ناظم، معتمد مال، مہتمم تعلیم وتربیت جو سابق ممبر مجلس عاملہ ہوتے

اس کے علاوہ بقیہ پانچ ممبران کا انتخاب مجلس شوریٰ کے ممبران سے ہوتا ہے۔ مجلس عاملہ شوریٰ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔

مجلس تعلیمی ایک صلاح کار کمیٹی ہوتی ہے۔ یہ تعلیمی امور سے متعلق ہوتی ہے۔ تعلیم سے متعلق سفارشات مرتب کرتی ہے۔ تعلیمی نظام کی اصلاح پر غور وفکر کرتی ہے۔ ناظم، مہتمم اور صدر اس کے سابق ممبر ہوتے ہیں بقیہ چھ ممبران شوریٰ سے منتخب ہوتے ہیں۔ شوریٰ کے علاوہ حضرات بھی اس کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ ۱۵رجنوری ۱۹۹۷ء کے نئے اصلاح شدہ آئین کے مطابق شیخ الجامعہ کا عہدہ علمی رہنمائی و جامعہ کی سرپرستی کے لئے وجود میں لایا گیا۔ مولانا سید جلال الدین انصر عمری صاحب متفقہ طور پر جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

لائبریری:

کوئی بھی تعلیمی ادارہ لائبریری کے بنا ناقص ہوا کرتا ہے۔ جامعۃ الفلاح کی لائبریری کے اندر عربی، اردو، ہندی، انگریزی ودیگر زبانوں پر مشتمل تقریباً ۳۳ ہزار کتابیں ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں بعض مقامی تعلیم یافتہ حضرات کی ہدیہ کردہ کتابوں سے اس کا سفر شروع ہوا۔ اس میں اضافہ کے لئے ۱۷ر دسمبر ۱۹۶۲ء کے سالانہ اجلاس میں انتظامیہ نے ایک ہزار روپیہ کی کتابوں کی خریداری کی منظوری دی۔ ۱۹۶۳ء میں لائبریری کے اندر صرف ۷۰۲ کتابیں ہی تھیں جو موجودہ ہاسٹل کے اندر ایک یا دو الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مختصری کتابیں بھی صرف Text Book پر مشتمل تھیں۔ ۱۹۷۷ء میں اساتذہ بہی خواہان اور خصوصاً طلبہ قدیم نے توسیع لائبریری کے لئے غیر معمولی کوششیں کیں۔ نتیجتاً لائبریری کو دوسرے ہال میں منتقل کر دیا گیا اور اس میں متعدد کتب کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں ایک لائبریرین کا تقرر ہوا اور طلبہ کے لئے لائبریری سے استفادہ لازمی قرار پایا۔ ۱۹۹۵ء تک طلبہ ۵ گھنٹے روزانہ لائبریری میں صرف کرتے تھے۔ طلبہ کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر ذمہ داران کو دار المطالعہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہیں لائبریری بڑھتی ہوئی کتابوں کی مانگ کو پورا کرنے سے بھی قاصر نظر آنے لگی۔ لہٰذا ایک نئی لائبریری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ذمہ داران وبہی خواہان جامعہ کی کوششوں سے ایک مرکزی لائبریری کی ۱۹۹۶ء میں بنیاد پڑی۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کی نگرانی بالفعل اس کی ۱۹۹۹ء میں پایۂ تکمیل

کو پہنچی۔ ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو لائبریری کو نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

فی الحال لائبریری میں سات افراد سرگرم عمل ہیں۔ لائبریری میں ۳۳ ہزار کتب کا ذخیرہ ہے۔ بے شمار ماہنامے، پندرہ روزہ، ہفتہ وار و روزمرہ شائع ہونے والے جرائد و رسائل و اخبارات عربی، اردو، ہندی، فارسی و انگریزی میں یہاں دستیاب ہیں۔

کم سے کم وقت میں طلبہ کو زیادہ سے زیادہ مستفید کرنے کی غرض سے لائبریری نے شعبہ جات میں ذیلی لائبریریاں بھی قائم کر دی ہیں۔ مثلاً:

☆ شعبۂ اعلیٰ (۱۹۸۷ کتابیں)

☆ شعبۂ ثانوی (۱۱۶۰ کتابیں)

☆ شعبۂ اعلیٰ نسواں (۵۳۲۹ کتابیں)

☆ جمعیۃ الطلبہ (۶۴۳۵ کتابیں)

☆ جمعیۃ الطالبات (۶۰۰۰ کتابیں)

جس طرح اصحاب خیر سے مالی تعاون حاصل کیا جاتا ہے ویسے ہی اصحاب علم سے جامعہ کی لائبریری کے لئے کتابیں طلب کی جاتی ہیں۔ وہ حضرات جنھوں نے اپنی زندگی یا بعد الممات لائبریری کو اپنی کتب ہدیہ کی ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

☆ مولانا جلیل احسن ندوی صاحب (بعد الموت) ۴۹۶ کتابیں

☆ مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب " ۱۰۴ کتابیں

☆ مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب ۵۰ کتابیں

☆ مولانا عبدالحی صاحب ۵۰ کتابیں

☆ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب (بعد الموت) ۳۰۵ کتابیں

☆ مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب ۴۷۰ کتابیں

☆ محترم سلطان مبین صاحب ۲۱۱۰ کتابیں

☆ مولانا نور محمد فلاحی صاحب (بعد الموت) ۱۵۰ کتابیں

☆ ڈاکٹر ضیاء الرحمن اعظمی صاحب ۱۵ کتابیں

جماعت اسلامی سے رشتہ و تعلق :

جماعت اسلامی ہند سے جامعۃ الفلاح کا رشتہ و تعلق ابتدا ہی سے رہا ہے۔ عام رائے کے مطابق سب سے پہلے مولوی جنید احمد اشرف پور نے قصبہ بلریا گنج کو اپنی مسلسل مخلص کوششوں کے ذریعہ جماعت اسلامی سے مربوط کیا۔ قصبہ بلریا گنج سے جماعت اسلامی کے سب سے پہلے ممبر حکیم محمد ایوب صاحب ہیں۔ ۱۹۵۲ء سے جامعہ کا جو دوسرا دور شروع ہوا اس کے روح رواں اور میر کارواں حکیم صاحب ہی تھے۔ حکیم جی اور ان کے شریک کار ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، مولوی محمد عیسیٰ صاحب و دیگر حضرات قیم جماعت ملک حبیب اللہ قاسمی صاحب و ناظم ضلع مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب سے باواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جامعۃ الفلاح کے امور و مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے اور پھر فیصلے کرتے۔ بعد میں ۲۵؍ دسمبر ۱۹۶۲ء کو مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب مجلس تعلیمی کے رکن منتخب ہوئے۔

دوسری جانب مولانا نظام الدین اصلاحی، ملک حبیب اللہ قاسمی اور مولانا ابوبکر اصلاحی نے مولانا مجیب اللہ صاحب سے مل کر اعظم گڑھ میں مارچ ۱۹۶۲ء میں جامعۃ الرشاد نامی عربی ادارہ قائم کیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا مجیب اللہ صاحب و ملک حبیب اللہ قاسمی صاحب کے درمیان نزاع پیدا ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک حبیب اللہ صاحب اور ان کے ہم نوا جامعۃ الرشاد سے مایوس ہو گئے اور جامعۃ الفلاح کا رخ کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ملک حبیب اللہ و مولانا ابوبکر اصلاحی جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ کے بنیادی ممبر منتخب کیے گئے۔

۱۹۶۶ء میں مجلس شوریٰ کے اندر جماعت اسلامی ہند نے اعظم گڑھ کے گاؤں زمین رسول پور میں ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ ۱۹؍ مئی ۱۹۶۶ء کو منعقد انتظامیہ کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح جامعۃ الفلاح جماعت اسلامی ہند کے براہ راست ربط میں آ گیا اور جماعت اسلامی ہند کے اراکین نے رضاکارانہ طور پر جامعہ کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔

یہ بات واضح رہے کہ جماعت اسلامی ہند سے جامعہ کا کوئی Official Link نہیں ہے۔ یہ ایک خود مختار و آزاد ادارہ ہے۔ جامعہ ہمیشہ سے ہمہ گیر و آفاقی کردار کا حامل رہا ہے۔ یہ کسی گروہ، فکر یا خاص مسلک تک محدود نہیں ہے بلکہ وسعت قلب و نظر و فکر کا مظہر اتم ہے۔

انجمن طلبہ فلاح :

جامعۃ الفلاح میں طلبہ کی ایک انجمن ہے جس کو جمعیۃ الطلبہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ انجمن طلبہ کی تعلیمی و انتظامی صلاحیت کو فروغ دینے کو اپنا مطلوب و مقصود سمجھتی ہے۔ یعنی اس کا مقصد طلبہ کی تعلیمی و انتظامی صلاحیت کو پروان چڑھانا و جلا بخشنا ہے۔ اس کی سرپرستی میں سیمینار، بحث و مباحثہ و مسابقہ وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ انجمن اپنا اعلامیہ بھی جاری کرتی ہے۔ مختلف علوم و فنون پر مشتمل جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری بھی ہے۔ اساتذہ کی نگرانی میں برجستہ اردو، عربی، ہندی و انگریزی تقریر پیش کرنے کے لئے یہ ہفتہ واری ثقافتی پروگرام بھی منعقد کراتی ہے۔ صفائی، خدمت خلق، دستور و باغبانی کے لئے طلبہ کو ذمہ دار بھی بناتی ہے۔ مزید برآں دو دستی خبرنامے بھی انجمن جاری کرتی ہے تاکہ طلبہ کی ذہنی سطح ترقی کر سکے اور ان کی علمی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں۔ اسی طرح کی انجمن کلیۃ البنات میں بھی سرگرم عمل ہے۔ اس کا نام جمعیۃ الطالبات ہے۔ یہ بھی وہی امور انجام دیتی ہے جو جمعیۃ الطلبہ کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حکیم محمد ایوب صاحب ندوی کے انتقال پر

﴿ نذرانۂ عقیدت ﴾

وہ ظاہری نگاہ سے جس دم گذر گئے
دل میں سما گئے تو جگر میں اتر گئے
خاکی تھا جسم خاک میں تو مل گیا مگر
وہ اوج پر تھے اوج سماوات پر گئے
باقی انھیں تھا رہنا بقا ہو گئی نصیب
ویرانۂ فنا سے سلامت گذر گئے
جب تک رہے حیات تو پھلدار کی طرح
رخصت ہوئے تو ہیں کے گل تر بکھر گئے
میں ان کو ڈھونڈتا ہوں ستاروں کی بزم میں
سورج سے تم کہو کہ بتائے کدھر گئے
رمضان میں بلایا ہے اللہ نے انھیں
کیوں لوگ کہہ رہے ہیں کہ ایوب مر گئے

(قمر رسول پوری)

(تعارف کتب)

اسلامی مصادر کا تعارف

(۱۱)

ڈاکٹر عبدالوہاب ابراہیم ابوسلیمان
(جامعہ ام القریٰ، مکہ المکرمہ)

فقہ مالکی کے اہم مصادر:

[۱] المدونة فی فروع المالكية :

فقہ مالکی پر لکھی گئی سب سے معتبر کتاب ہے۔ مالکی مسلک کی انتہائی بنیادی اور اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ ابن یونس کہتے ہیں: ''کتاب اللہ کے بعد سب سے موزوں اور نافع کتاب موطا مالک اور اس کے بعد مدونہ سحنون ہے۔ کیونکہ اس کی تدوین میں چار مجتہدین: مالک، ابن القاسم، اسد اور سحنون نے حصہ لیا ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن محمد عبدالرحمن کہتے ہیں: مدونہ اصلاً قیروان کے قاضی اسد بن الفرات کی ان فقہی مسموعات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے عبدالرحمن بن القاسم سے سنا تھا۔ اور عبدالرحمن اور اسد دونوں امام مالکؒ کے شاگرد ہیں۔ اسد بن الفرات نے یہ فقہی استفسارات اہل عراق کے طرز پر ابن القاسم سے کیے تھے اور ابن القاسم نے ان کے جوابات امام مالک کے فتاویٰ یا ان کے فتاویٰ کے نظائر و شواہد پر قیاس کر کے دیئے تھے۔ چنانچہ قیروان میں آپ سے اس کتاب کو سماع آپ کے شاگردوں نے کیا۔ اسے ''الاسدیہ'' ''کتاب اسد'' اور مسائل ابن القاسم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کی کتابت علامہ سحنون نے کی تھی۔

المدارک میں ہے کہ اسد نے اس کتاب کو سحنون کو دینے سے انکار کر دیا تھا پھر سحنون کے اصرار پر انھیں یہ کتاب عنایت فرمائی پھر سحنون اسے لے کر ابن القاسم کے پاس آئے اور اس کتاب کا ان سے سماع حاصل کیا اور متعدد اشیاء میں اصلاح فرمائی اور پھر اسے واپس قیروان لے آئے۔ تالیف کے لحاظ سے اب بھی یہ کتاب اسد کی کتاب ہی کی طرح غیر مرتب تھی۔ تراجم وغیرہ مفقود تھے۔ مسائل

اور ابواب غیر مرتب تھے۔ پھر سحنون نے از سر نو اس پر نگاہ ڈالی۔ ابواب ترتیب سے قائم فرمائے۔ بعض مسائل کا اخراج کیا۔ اور اسے مہذب و مرتب بنا دیا اور اس میں درج مسائل کے دلائل موطا ابن وھب سے فراہم کیے اور امام مالک کے بڑے شاگردوں کے باہمی اہم اختلافات کا بھی اضافہ فرمایا۔ البتہ بعض اجزاء پر نظر ثانی سے پہلے قضا آ پہنچی اسی لئے اسے "المدونة و المختلطة" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب "الام" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔

[۲] الواضحة فی السنن و الفقه : عبدالملک بن حبیب بن سلیمان بن ہارون ابن جاہمۃ السلمی

یہ کتاب فقہ مالکی کے اہم ترین مصادر میں سے ایک ہے۔ علامہ عتبی کہتے ہیں: "عبدالملک پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ کسی بھی عالم نے فقہ اہل مدینہ کے مطابق آپ جیسی کتاب نہیں لکھی"

[۳] المستخرجة العتبية على الموطا: محمد العتبی بن احمد بن عبدالعزیز الاموی القرطبی

مالکی مسلک کی شاذ روایات اور فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عجیب و غریب مسائل عتبی کے پاس لائے جاتے۔ جو مسئلہ آپ کو نادر نظر آتا اسے المستخرجہ میں داخل کرنے کا حکم دے دیتے۔ ابن لبابہ کہتے ہیں: "فقہ میں عتبی کے ساتھ کوئی گفتگو کرنے والا اور آپ کی طرح مسائل کو سمجھنے والا نہ تھا الا آنکہ کسی نے آپ سے فقہ کا درس لیا ہو"۔

[۴] الموازیة : محمد بن ابراہیم الاسکندری (ابن المواز) (۲۶۹ھ)

فقہ مالکی پر لکھی جانے والی اہم ترین، صحیح ترین، مبسوط و مفصل کتاب ہے۔ قابسی نے اسے بقیہ تمام امہات کتب پر ترجیح دی ہے۔

یہ چاروں مصادر فقہ مالکی میں بنیادی چار مصادر کے نام سے معروف ہیں۔

[۵] رسالة ابن أبي زيد القيرواني (باكورة السعد): ابو محمد عبداللہ بن ابی زید القیروانی (۳۸۹ھ)

متوسط درجہ کی کتاب ہے۔ فقہ و آداب کے علاوہ عقیدہ کے اصولی مسائل پر بھی مشتمل ہے۔ مؤلف کتاب اس کتاب کے منہج و اہداف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "آپ کی طلب و خواہش کے مطابق دینیات کے بنیادی امور اور شریعت و آداب پر مشتمل یہ کتاب مسلک امام مالک کے لحاظ سے میں نے ترتیب دی ہے۔

[۶] الذخیرة: شہاب الدین ابو العباس احمد بن ادریس بن عبدالرحمن الصنہاجی القرافی (۶۸۴ھ)

مذاہب اربعہ پر عموماً اور مسلک مالکی پر خصوصاً یہ ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ مؤلف کا مقصود مختلف مسالک کے ذکر کے ذریعہ اس بات کی توضیح و تبیین تھی کہ حق و صواب ان کے یا کسی دوسرے کے مسلک و مذہب ہی پر منحصر و موقوف نہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں: میں نے مخالفین کے مسالک اور ان کے دلائل کا تذکرہ اکثر مسائل میں مزید واقفیت اور فائدہ کے لئے کیا ہے کیونکہ حق کسی ایک ہی جہت اور مسلک پر موقوف نہیں۔ نیز اس سے فقیہ کو بھی تقویٰ سے قریب تر اور مضبوط دلیل پر موقوف مسائل کی واقفیت بھی ہوگی۔

اسی بناء پر اس کتاب کا شمار مالکی مصادر کے ساتھ ساتھ فقہ مقارن کے مراجع میں بھی ہوتا ہے۔ جن بھی مصادر پر مؤلف نے اعتماد کیا ہے اس کے سلسلے میں انھوں نے اپنے مقدمہ میں یوں روشنی ڈالی ہے: میں نے ان پانچ کتابوں پر مالکی مسلک کے تعلق سے بھرپور اعتماد کیا ہے جو مشرق و مغرب میں مالکیوں کے لئے مصدر و مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ کتابیں درج ذیل ہیں:

☆ المدونة : سحنون بن سعید

☆ الجواهر : ابو محمد عبداللہ بن نجم

☆ التلقين : القاضی عبدالوہاب بن علی بن نصر

☆ التفريع : ابن الجلاب

☆ الرسالة : القیروانی

ان کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے جملہ فروعی مسائل کو انتہائی مرتب انداز میں جمع کیا ہے۔ اور کتابوں، ابواب اور فصول کی تعیین میں باہم مناسبتوں کا التزام کیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مالکی مسلک کی تقریباً چالیس دیگر کتابوں اور شرحوں پر اعتماد کیا ہے۔ حدیث و لغت کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔ نیز علامہ قرافی نے اپنے مقدمہ میں ان رموز و اشارات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو کتاب میں جا بجا ذکر ہیں۔ یہ شرح طوالت اور اختصار مخل سے خالی ہے۔

کتاب کے آغاز میں علم کی فضیلت اور اس کے آداب پر نیز اصول فقہ اور قواعد فقہیہ پر بھی

پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

[۷] المختصر في الفقه المالكي : علامہ شیخ خلیل بن اسحاق المالکی (۷۶۷ھ)

متاخرین کے نزدیک یہ کتاب انتہائی معتمد علیہ اور عوام کے نزدیک حجت شمار کی جاتی ہے۔ مالکی مسلک کے مسائل کو مضبوط اور محکم اسلوب میں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

رموز و اشارات کی تفصیل درج ذیل ہے ''فیہا'' کے ذریعہ مدونہ کی جانب ''اول'' کے ذریعہ مدونہ کے شارحین کے درمیان کسی مسئلہ کے فہم میں اختلاف کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اور امام لخمی کی جانب ''الاختیار'' کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر فعل کا استعمال ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف اقوال کے درمیان ان کی ترجیح یہ ہے اور اگر اسم کا استعمال ہو تو خود ان کا اپنا اختیار مراد ہوتا ہے۔

''الترجیح'' کے ذریعہ ابن یونس ''الظہور'' کے ذریعہ ابن رشد ''القول'' کے ذریعہ المازری مراد ہوتے ہیں۔ اور لفظ ''خلاف'' سے مراد مشہور ہونے میں اختلاف مراد ہے اور ''قولین'' کے ذریعہ اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے ان دونوں فرعی مسئلوں میں کون راجح ہے اس کی کوئی اطلاع مؤلف کو نہ ہو سکی۔

مؤلف کے نزدیک صرف مفہوم شرط معتبر ہے۔ اس کی جانب وہ ''صحح'' کے ذریعہ اشارہ کرتے ہیں۔ اور لفظ ''استحسن'' کے ذریعہ ان شیوخ کی ترجیح مراد ہوتی ہے جو مذکورہ بالا شیوخ کے علاوہ ہیں۔ ''تردد'' کے ذریعہ متاخرین کے نقل میں متردد ہونے یا متقدمین کی اس مسئلہ میں کسی نص کے نہ ہونے کی جانب اور ''لو'' کے ذریعہ مسلکی اختلاف کی جانب اشارہ مراد ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مذاہب عالم

توریت کا تعارف

قرآن مجید اور توریت کے مشترک امور

انیس احمد مدنی

قانون صلح و جنگ

جنگ کے اغراض و مقاصد

ایک شخص رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور بولا کہ کوئی شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے کوئی شہرت و ناموری کے لئے جنگ کرتا ہے کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے۔ فرمایئے کہ ان میں سے کس کی جنگ راہ خدا میں ہے۔ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ راہ خدا کی جنگ تو صرف اس شخص کی ہے جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے لڑے۔ (بخاری)

اور خداوند نے موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا:

بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہہ۔ جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہوئے تو تم ان سب کو اس زمین کے باشندے ہیں اپنے سامنے سے بھگاؤ ان کی مورتیں فنا کرو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھادو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کرو اور وہاں آپ بسو، کیونکہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک ہو (۳۳: ۵۰۔ ۵۳) اور کتاب استثنا میں ہے:

''سو تم اٹھو کوچ کرو اور شہر ارنون کے پار جاؤ دیکھو میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر (۲: ۲۴)

مولانا سید ابوالاعلیٰ المودودیؒ لکھتے ہیں! ”ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا اور قوت کے حق کی بنا پر ان کے اموال و املاک اور خود ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا اس کی نگاہ میں جائز ہے اور اس کے نزدیک یہی قہر و تسلط اس وراثت ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے مگر قرآن وراثت ارضی کو کسی ایک نسل یا قوم کا نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے۔

”زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ (۲۱/۱۰۵)

تورات میں وراثت ارضی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے گھر بار، ملک و مال اور جان و آبرو کی مالک بن جائے اور اس کو فنا کر کے خود اس کی جگہ بسے۔ مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو وراثت ارضی دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس قوم کو صالح ہونے کی بنا پر اپنی خلافت و نیابت کے لئے چن لیا اور اپنی زمین کا انتظام اس کے سپرد کیا تا کہ وہ ظلم و جور کو مٹا کر اس کی جگہ عدل و انصاف کا نظام قائم کرے پھر تورات میں میراث کی زمین حاصل کرنے کیلئے جنگ کا حکم دیا گیا ہے مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ فلاں ملک تمہاری قومی میراث ہے لہذا تم اسے لڑ کر فتح کرو پس تورات کی ”وراثت ارضی“ کھلی کھلی ملک گیری ہے۔ اسلام کے جہاد کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے۔

حدود جنگ

جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہم کو تورات میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے پیروؤں کو دشمن کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت دیتا ہے اس کے لئے درج ذیل احکام قابل مطالعہ ہیں۔ کتاب استثناء میں ہے۔

”اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے آ پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام کرتب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دیں کہ صلح منظور ہے اور دروازہ تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ

جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دے دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کی ساری لوٹ اپنے لیے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو“ (۲۰-۱۳۱)۔

”جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کر کے اسے لو مدت تک محاصرہ کیے رہو تو تیر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے سو تو انہیں محاصرہ کے کام میں لانے کے لیے کاٹ نہ ڈالیو، کیونکہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں“ (۲۰-۱۹)

”لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیوں بلکہ تو ان کو حرم کیجیو“ (۲۰:۱۶-۱۷)

”اور جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کر دے تو تو انہیں مار یو اور حرم کیجیو۔ نہ تو کوئی ان سے عہد کیجیو اور نہ ان پر رحم کریو تو ان کے مذبحوں کو ڈھا دو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو“ (۷:۲-۵)

”تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہو گے اپنے معبود کی بندگی کی ہے اونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے، نیست و نابود کر دیجیو، ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو اور ان کے ستونوں کو توڑیو اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو اور ان کے معبودوں کی کھدی ہوئی مورتوں کو چکنا چور کیجیو اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو“ (۲:۴)

”آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں اموریوں اور کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے ہانکتا ہوں۔ ہوشیار رہ تا نہ ہوئے کہ تو اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھ لیوے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عہد تیرے درمیان پھندا ہو بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالو“ (۳۴:۱۱-۱۴)

کتاب اعداد میں ہے: ”پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہل مدیان سے بنی

اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اس کے اپنی قوم کے لوگوں سے مل جائے گا تب موسیٰ نے لوگوں کو فرمایا کہ بعض تم میں سے لڑائی کے لیے تیار ہوں......سو ہزاروں بنی اسرائیل میں سے ہر فرقہ کے ایک ایک ہزار حاضر ہو گئے یہ سب جو لڑائی کے لیے ہتھیار بند تھے ۱۲ ہزار ہوئے......اور انہوں نے مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰ سے فرمایا اور سارے مردوں کو قتل کیا......اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مویشی اور بھیڑ بکری اور مال واسباب سب کچھ لوٹ لیا۔ اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا۔ اور انہوں نے ساری غنیمت اور سارے حیوان لیے اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ موسیٰ اور ایلعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، مواب کے میدانوں میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل لائے......اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سردار تھے اور ان پر جو سینکڑوں کے سردار تھے، جو جنگ کر کے پھرے تھے، غصہ ہوا اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟......سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کرو اور ہر ایک عورت جو مرد کی صحبت سے واقف تھی جان سے مارو، لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو" (۳۱:۱۔۱۸)

"اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے مرد کیا عورت، کیا جوان کیا بوڑھا، کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا سب کو بیک لخت تہ تیغ کر کے ختم کیا......پھر انہوں نے اس شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا۔ مگر روپیہ اور سونا اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کیے" (۶:۲۱۔۲۵)

"اور انہوں نے عی کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع کے پاس لائے اور ایسا ہوا کہ جب اسرائیل میدان میں اس بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا عی کے لوگوں کو قتل کر چکے اور جب وہ سب تہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ ہزار تھے، یعنی عی کے سب لوگ۔ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم نہ کر لیا

نہ کھینچا۔ اسرائیل نے اس شہر کے فقط مواشی اور اسباب کو اپنے لیے لوٹا، خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا"۔ (۸:۲۳۔۲۸)

مذکورہ بالا عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے ایک وہ جنہیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا ہے دوسرے وہ جنہیں اس نے ان کی میراث میں دیا ہے ان دونوں کے ساتھ اس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لیے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انہیں صلح کا پیغام دیا جائے اور اگر وہ اسے قبول کر کے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کر دیں تو ان کو باجگذار اور خدمت گزار بنا لیا جائے لیکن اگر وہ صلح نہ کریں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور مال اسباب پر قبضہ کر لیا جائے۔ دوران جنگ میں باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت ہے، مگر اس لیے نہیں کہ یہ ایک مفسدانہ فعل ہے بلکہ اس لیے کہ انہیں اس طرح خراب کر دینے سے فتح حاصل ہونے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔ دوسرے قسم کے دشمنوں کو وہ تمام انسانی حقوق اور رعایات سے محروم کر دیتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح و معاہدہ نہ کیا جائے، ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے، ان کی کھیتیاں اور باغات اور عمارتیں اور عبادت گاہیں سب تہس نہس کر دی جائیں ان کی عورتیں، مرد، بچے حتی کہ جانور تک تہ تیغ کر دیے جائیں اور روئے زمین سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے اس جنگ کی غایت صرف یہ قرار دی گئی ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں نیست و نابود کر دی جائیں۔ ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش کی ہی نہیں گئی جسے پورا کرنے کے بعد ان کی جان بخشی ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں، وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کر رہی ہے اس پر جیتا جاگتا تبصرہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست ہے جو اسی میراث ارضی کے تخیل پر قائم ہوئی اور اس بیسویں صدی میں اس نے عربوں کے ساتھ وہی کچھ کر کے دکھا دیا جس کی ہدایت توریت میں دی گئی تھی۔

"الجہاد فی الاسلام، سید ابوالاعلیٰ المودودی"

بحث و نظر

سماع حدیث اور اس کی روایت

(تحمل الحدیث و أداؤہ)

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب

حدیث کے اخذ و سماع کو محدثین "التحمل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ تحمل کے معنی آتے ہیں شیخ سے حدیث کا اخذ و سماع کے معروف و جائز طریقوں میں سے کسی طریقے سے حاصل کرنا۔

روایت حدیث اور اس کی تبلیغ کو "الاداء" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اخذ و سماع کی اہلیت:

جمہور اہل علم کے نزدیک غیر مکلف نابالغ لڑکے کا سماع جائز و درست ہے البتہ بعض اہل علم اس کو جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن جمہور اہل علم کی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ صحابہ اور تابعین نے صغار صحابہ جیسے حسنؓ، حسینؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوسعید الخدریؓ اور محمود بن الربیعؓ وغیرہ کی روایات کو اس تفریق کے بغیر قبول کیا ہے کہ انھوں نے کن احادیث کا سماع بلوغت سے پہلے کیا ہے اور کن کا بلوغت کے بعد۔

نابالغ بچوں کا سماع کس عمر میں درست ہوگا اس سلسلے میں علماء کی تین رائیں ہیں:

[۱] کم سے کم سماع کی عمر پانچ سال ہے۔ یہ رائے جمہور محدثین کی ہے۔ ان کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے۔ محمود بن الربیعؓ فرماتے ہیں: "مجھے وہ کلی اب تک یاد ہے جو آپ ﷺ نے ایک ڈول کے پانی سے میرے چہرے پر ماری تھی درآنحالیکہ میں پانچ سال کا تھا۔"

[۲] حافظ موسیٰ بن ہارون الحمال کے نزدیک بچوں کا سماع اس وقت صحیح ہوگا جب وہ گائے اور گدھے کے درمیان فرق کر لے۔ گمان غالب ہے کہ آپ کی مراد تمیز رہی ہوگی۔ اور پھر آپ نے تمیز کی تعیین اپنے اردگرد کی اشیاء سے کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اگر بچہ خطاب و گفتگو کو سمجھ لے اور

جواب دینے پر قادر ہو تو اسے ممیز مانیں گے اور اس کا سماع درست ہوگا خواہ اس کی عمر پانچ سال سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر وہ خطاب کو نہ سمجھ سکے اور جواب لوٹانے پر بھی قادر نہ ہو تو اس کا سماع درست نہ مانا جائے گا خواہ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ رائے اکثر متاخرین کی ہے۔

مختصر یہ کہ بچوں کے سماع کے قائلین کا اس امر پر سب اتفاق ہے کہ بچہ کا سماع اس وقت معتبر ہوگا جب وہ اشیاء کو یاد کرنے اور تمیز پر قادر ہو۔ اکثر اہل علم بچوں کو علم کے حلقوں میں شرکت پر ہمت افزائی کرتے تھے بلکہ اعمش وغیرہ کا تو یہ حال تھا کہ آپ بچوں کو جمع کر کے ان سے حدیثیں بیان کرتے تھے۔ یہ بلوغت سے قبل سماع کے متقدمین و متاخرین کے نزدیک درست ہونے کی عملی دلیل ہے۔

ادائیگی کی صلاحیت و اہلیت:

جمہور اہل حدیث اور اصولیین کے نزدیک جن راویوں کی مرویات قابل استدلال ہوں گی ان کے اندر درج ذیل شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

[۱] **اسلام** : بالاتفاق کسی کافر کی روایت مقبول نہ ہوگی خواہ وہ جھوٹ سے پرہیز کرتا ہو یا نہ کرتا ہو کیونکہ اس کی روایت کو قبول کرنا گویا مسلمانوں پر اس کے قول کو جاری و نافذ کرنا ہوگا۔ اور آخر اس شخص کی روایت ہم کیسے قبول کر سکتے ہیں جو اسلام کے خلاف تدبیریں و چالیں چلتا ہو۔ پھر اللہ عزوجل نے فاسقوں کی خبروں کے تعلق سے بھی توقف کا حکم دیا ہے تو کافر کی روایت تو بدرجہ اولیٰ رد کر دی جائے گی۔

[۲] **بلوغت** : بلوغت پر تکلیف کا دارومدار ہے۔ چنانچہ کسی بھی ایسے راوی کی روایت مقبول نہ ہوگی جو بالغ نہ ہو۔ مشہور حدیث ہے۔ "تین افراد سے قلم کو اٹھا لیا گیا ہے، مجنوں شخص سے یہاں تک کہ اسے شفا مل جائے، اور سوئے ہوئے شخص سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے اور بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے۔"

بلوغت سے مراد احتلام کی عمر کو پہنچنے کے ساتھ ساتھ عقل و فہم والا ہونا ہے۔ اسی لئے بعض متاخرین بلوغت کے ساتھ عقل کی بھی شرط لگاتے ہیں اور متقدمین صرف عقل کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں کیونکہ عقل و فہم اور ادراک کا حصول عموماً بلوغت کے بعد ہی ہوتا ہے۔

نابالغ بچوں کی روایات سے علماء نے اس لئے احتراز کیا ہے کیونکہ وہ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ کم فہمی اور جھوٹ کے عواقب انجام سے بے خبری کی بنا پر ان کے لئے جھوٹ بولنا آسان ہے۔ پھر جب شریعت نے انھیں دنیاوی امور و معاملات کا ذمہ دار نہیں بنایا ہے تو پھر وہ آخر دین کے معاملہ میں ذمہ دار کیوں کر بن سکتے ہیں۔

[۳] **عدالت** : نفس میں ثابت و راسخ اس صفت کا نام ہے جو اپنے صاحب کو تقویٰ و پرہیزگاری اور انسانی شرافت و مروت کو ہمہ وقت اختیار کرنے پر آمادہ کرے۔ جس سے دلوں میں اس کی صداقت کا یقین پیدا ہو جائے۔ اور جس میں بڑے گناہوں اور بعض چھوٹے گناہوں سے اجتناب بھی پایا جائے جیسے ایک دانہ کی ڈنڈی مارنا، اور ایک لقمہ کی چوری کرنا نیز مروت کے منافی امور کو انجام دینا جیسے راستہ میں کھانا یا پیشاب کرنا، پست ترین اور گھٹیا لوگوں کی صحبت اختیار کرنا اور بے پناہ اور حد سے زیادہ ہنسی و مذاق کرنا۔

[۴] **ضبط** : حدیث کی سماعت کے وقت سے ادائیگی کے وقت تک کامل بیداری اختیار کرتے ہوئے روایت کو صحیح طور سے یاد رکھنا اور اس کے مفہوم کو سمجھنا ضبط کہلاتا ہے۔ ضبط کی دو قسمیں ہیں: ضبط صدر اور ضبط کتاب۔

ضبط صدر کا مطلب یہ ہے کہ راوی اگر اپنے حفظ پر اعتماد کر رہا ہے تو اسے وہ روایت صحیح طور پر یاد ہونی چاہئے۔ اور اگر کتاب پر اعتماد کر رہا ہے تو اسے اپنی کتاب کی نگہداشت کرنی چاہئے کہ اس میں کوئی شخص، کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی یا کمی و بیشی نہ کر سکے۔

کسی راوی کے ضبط کی معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی حدیث کا دیگر حفاظ حدیث کی مرویات سے موازنہ کیا جائے اگر عموماً اس کی مرویات دیگر ثقہ راویوں کی مرویات سے میل کھاتی ہیں تو اسے ضابط سمجھا جائے گا اور اگر اکثر اس کی مرویات دیگر ثقہ راویوں کی مرویات کے مخالف ہوتی ہیں تو اس کا ضبط گڑبڑ مانا جائے گا اور اس کی حدیث غیر معتبر ہوگی۔ نیز ادائیگی کے وقت راوی کے اندر مذکورہ بالا چاروں شرطوں کا پایا جانا بھی ضروری ہے، اسلام، بلوغت، عقل اور عدالت۔ البتہ سماع کے وقت صرف تمیز کا اعتبار ہوگا۔

اخذ و سماع کے طریقے :

اخذ و سماع کے مشہور طریقے آٹھ ہیں:

[۱] **السماع** : سماع کا مطلب یہ ہے کہ شیخ اپنے حفظ یا کتاب سے حدیث کو پڑھے اور مجلس میں موجود طلباء اس کے الفاظ کو سنیں خواہ مجلس املاء کرانے کے لئے منعقد کی گئی ہو یا کسی دوسرے امر کے لئے۔ محدثین کے نزدیک اخذ و تحمل کا یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔ البتہ بعض فقہاء کے نزدیک شیخ سے سننے کے بعد اس کو لکھ لینا مجرد سماع سے افضل و ارجح ہے کیونکہ اس صورت میں شیخ حدیث بیان کرتے ہیں اور راوی اسے نوٹ کرنے میں لگا ہوتا ہے۔ لہذا غفلت کا احتمال کم اور تحقیق کی جانب رجحان زیادہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً املاء کے بعد لکھی ہوئی چیز کا مقارنہ و موازنہ کیا جاتا ہے۔

[۲] **القراءة على الشيخ** : (شیخ کے سامنے پڑھنا)

اکثر محدثین اسے "عرض" اور بعض "عرض القراءة" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ طالب اپنے استاذ کے سامنے اس چیز کو پیش کرتا ہے جسے وہ پڑھتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے طلبہ قرآن مجید کو قاری کے سامنے پیش کرتے یعنی سناتے ہیں۔ "قراءة" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شاگرد اپنے استاذ کے سامنے اپنے حفظ یا اپنی کتاب سے روایات کو پڑھتا ہے اور استاذ ان مرویات کو اپنے حفظ یا کتاب کی روشنی میں بغور سنتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ شخص جس کے سامنے احادیث پڑھی جاتی ہیں وہ شیخ کے علاوہ کوئی دوسرا معتبر شخص بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی متعدد رواۃ اپنے تصحیح شدہ نسخوں کو ملانے کے لئے شیخ کی موجودگی میں پڑھنے والے کی روایات کو سنتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فقہ و فتاویٰ

ابوارقم فلاحی

سوال: کیا میت کی جانب سے قربانی کرنا جائز ہے؟

جواب: میت کی جانب سے قربانی کرنا جائز و مشروع ہے۔ حضرت علیؓ ہر سال محمد عربی ﷺ کی جانب سے قربانی کیا کرتے تھے۔

سوال: قربانی کن کن جانوروں کی مشروع ہے؟

جواب: قربانی صرف مویشیوں کی جائز ہے۔ مویشیوں میں صرف چار قسم کے جانور آتے ہیں۔ اونٹ، گائے، دنبہ، بکری۔

قرآن مجید میں ہے "ولیذکروا سم الله علیٰ ما رزقهم من بهيمة الأنعام..."

"اور چاہئے کہ وہ ان مویشیوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں عنایت فرمائے ہیں۔"

سوال: کیا بھینس کی قربانی جائز ہے؟

جواب: حنفیہ کے نزدیک بھینس کی قربانی جائز ہے کیونکہ وہ گائے کی جنس سے ہے۔ البتہ بعض فقہاء اس کی قربانی کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

سوال: قربانی کے جانوروں میں کن کن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے؟

جواب: قربانی کے جانوروں میں درج ذیل دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

[۱] عمر: اونٹ پانچ سال، گائے دو سال، بکری اور دنبہ ایک سال۔

[۲] عیوب سے پاکی: مشہور حدیث ہے۔ چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز نہیں: وہ لنگڑا جانور جو قربان گاہ تک چل کر نہ جاسکے، وہ اندھا جانور جس کی آنکھ باہر نکلی ہوئی یا دھنس گئی ہو، مریض و بیمار جانور، نحیف و لاغر اور گودے سے خالی جانور۔

سوال: گائے اور اونٹ میں کتنے لوگوں کی شرکت درست ہے؟

جواب: ایک گائے اور اونٹ میں زیادہ سے زیادہ سات لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

سوال: کیا گائے یا اونٹ میں ساتواں حصہ ایک بکرے سے افضل ہے؟

جواب: ایک بکرا یا دنبہ قربان کرنا گائے یا اونٹ میں ساتویں نام سے بہتر و افضل ہے۔

سوال: کیا اونٹ یا گائے میں سات ناموں کا اشتراک لازم ہے؟

جواب: اونٹ یا گائے میں سات ناموں کا اشتراک جائز ہے، واجب نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص اپنی جانب سے پوری گائے کرادے تو یہ زیادہ بہتر اور عمدہ ہوگا۔

سوال: قربانی کتنے دنوں تک جائز ہے؟

جواب: حنفیہ کے نزدیک قربانی کے ایام تین دن ہیں: دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک ایام قربانی چار ہیں۔ البتہ اختلاف سے بچنے کے لئے تین دن کے اندر ہی قربانی کر دینا بہتر ہے۔ اور پہلے دن کرنا زیادہ باعث اجر و ثواب ہے۔ اور دن میں قربانی کرنا رات میں قربانی کرنے سے زیادہ افضل ہے۔

سوال: کیا میت کے انتقال کے پہلے سال اس کی جانب سے قربانی کرنا لازم ہے؟

جواب: میت کے انتقال کے پہلے سال اس کی جانب سے قربانی کو لازم سمجھنا بے بنیاد ہے۔

سوال: کیا قصاب کو چمڑا یا گوشت وغیرہ اجرت کے طور پر دینا جائز ہے؟

جواب: قصاب کو چمڑا یا گوشت اجرت کے طور پر دینا حرام ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کے اونٹوں کی قربانی کراؤں اور ان کے گوشت، کھالیں اور کجاوہ کو صدقہ کر دوں اور قصاب کو ان میں سے کوئی چیز نہ دوں اور فرمایا کہ ہم قصاب کو اپنے پاس سے دیں گے۔

سوال: کیا فقیر قربانی کے گوشت کو جو اس کو ہدیہ میں ملا ہو فروخت کر سکتا ہے؟

جواب: فقیر قربانی کے اس گوشت کو فروخت کرسکتا ہے جو اس کے پاس ہدیہ یا صدقہ میں آیا ہو۔

سوال: کیا قربانی کرنے والے کے لئے ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں ناخن اور بال ترشوانا مکروہ ہے؟

جواب: قربانی کرنے والے کے لئے مستحب اور پسندیدہ یہ ہے کہ وہ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں نہ تو ناخن ترشوائے اور نہ ہی جسم کے کسی حصہ کا بال کٹوائے۔

سوال: کیا ایام تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے؟

جواب: عید کی طرح ایام تشریق میں بھی روزہ رکھنا حرام ہے۔ ارشاد رسول ﷺ ہے:

''أيام التشريق أيام أكل و شرب و ذكر الله عز و جلّ فاكثروا فيها من ذكر الله بالتكبير و التهليل و التحميد في ادبار الصلوات و في جميع الأوقات''

''ایام تشریق کھانے پینے اور ذکر الٰہی کو بلند کرنے کے دن ہیں۔ لہذا ان دنوں میں نماز کے بعد اور جملہ اوقات میں کثرت سے تکبیر، تحمید اور لا الہ الا اللہ کا ورد کرو۔''

☆☆☆☆☆

جامعہ کے لیل ونہار

ادارہ

سالِ نو کا آغاز: الحمد للہ ۲۰ نومبر سے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا ہے۔ تیس نومبر تک داخلہ ٹسٹ اور ششماہی امتحان کی جملہ کارروائیاں مکمل کرلی گئیں اور یکم دسمبر سے باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ اللہ تعالی اس نئے تعلیمی سال کو کامیاب بنائے اور اساتذہ نیز جملہ ذمہ داران جامعہ کو اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق بخشے۔

مہتمم تعلیم وتربیت کا افتتاحی خطاب: نئے تعلیمی سال کی مناسبت سے ۳۰ نومبر کو مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے اساتذہ، معلمات اور کارکنان کے سامنے مرکزی لائبریری کے ہال میں ایک تذکیری خطبہ دیا۔ آپ نے جامعہ کے ماحول کو مکمل علمی بنانے، اپنے اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دینے کی تلقین کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ تمام اساتذہ، طلبہ و طالبات اپنے جملہ تعلیمی و مذہبی امور میں بہترین نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں کہ یہی چیز جامعہ کی ترقی اور ہماری دینوی و اخروی کامیابی وقومی سرفرازی کا زینہ ہے۔ آخر میں مولانا نے آئندہ مثالی معلم و معلمہ کو توصیفی سند اور دس ہزار نقد کی شکل میں انعام دینے کا اعلان فرمایا۔ صدر جامعہ جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کی دعاء پر یہ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

جامعہ کے بعض قدیم اساتذہ کی سبکدوشی: ریٹائرمنٹ کے ضابطہ کے تحت مجلس عاملہ نے اس سال جامعہ کے درج ذیل اساتذہ کرام کی مدت تدریس میں بعد مزید توسیع کے توسیع منظور نہیں کی۔ جناب مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب، جناب مولانا عبد الحسیب اصلاحی صاحب اور جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب۔

جامعہ کی تاسیس، اس کی تعمیر وترقی اور استحکام میں ان اساتذہ کرام نے جو انتھک جدوجہد کی اس سے جامعہ کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص واقف ہے۔ ان کی بے مثال اور بے لوث قربانیوں نے

ہی جامعہ کو ترقی کے ان منازل سے ہمکنار کرایا۔ ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے ادارہ حیات نو یہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور جامعۃ الفلاح کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

بین الاقوامی سیمینار یہ اطلاع دیتے ہوئے ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ جامعۃ الفلاح میں ۲۵-۲۷ فروری ۲۰۰۵ء کو "دعوت اسلامی اور مدارس دینیہ" کے عنوان پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ اس اہم سیمینار میں درج ذیل اہم موضوعات زیر بحث آئیں گے:

دعوت دین کی اہمیت و ضرورت، آداب دعوت، تاریخ دعوت، دعوت دین کے فروغ میں مدارس کا کردار، دعوت دین اور ذرائع ابلاغ، عالمی تناظر میں دعوتی چیلنجز، ملکی تناظر میں دعوتی مسائل، اسالیب دعوت اور عصر حاضر، دعوتی لحاظ سے نصاب مدارس کا جائزہ، دعوتی نقطۂ نظر سے نصاب تعلیم میں مطلوبہ تغیرات، اوصاف داعی، دعوتی کام کے لئے باہمی اشتراک و تعاون کی ضرورت، اور دعوتی تجربات وغیرہ۔

سیمینار میں شرکت اور مقالات پیش کرنے کے لئے ملک اور بیرون ملک کے اہل علم و دانش کو دعوت دی گئی اور اہم مدارس اور دینی جماعتوں کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ متعدد افراد نے شرکت کی توثیق کر دی ہے۔ ان شاء اللہ یہ سیمینار ایک سنگ میل ثابت ہوگا اور اس کے توسط سے دعوت دین کے لئے ایک واضح لائحۂ عمل سامنے لایا جا سکے گا۔

جنت میں گھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من بنى لله مسجداً بنى الله له بيتاً في الجنة" جس نے اللہ کے لئے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنا دیتا ہے۔

کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح کے کامپلیکس میں مسجد (اجتماع گاہ) کی تعمیر کا کام ہونے جا رہا ہے جلد ہی سنگ بنیاد کی تقریب منعقد ہوگی۔ اس کار خیر میں حصہ لینا سعادت کی بات ہے۔ معلمین، معلمات، طلبہ و طالبات اور تمام حضرات سے اپیل ہے کہ اس کی تعمیر میں دل کھول کر حصہ لیں اور اپنی اعانتیں جامعہ بھجوائیں تاکہ تعمیر کا کام جلد از جلد مکمل ہو جائے۔ ☆☆☆☆☆